ابوصباحت

عالم اسلام

بہتر قیادت کے امکانات

ایک بار پھر مغربی طاقتیں اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لیے مسلم ممالک پر دباؤ بڑھا رہی ہیں۔ یہ معاملہ کسی ملک کو تسلیم کرنے کا نہیں بلکہ مسلم دنیا کے ایمان کے سینے میں خنجر گھونپنے کا ہے۔ اسرائیل کا وجود مسلم دنیا کے جسم میں پل پل پھیلتے ناسور جیسا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر اسرائیل کو قائم کرکے مغربی طاقتوں نے مسلم دنیا کے لیے ایک مستقل نوعیت کی اذیت کا سامان کیا۔ اسرائیل کے ذریعے مسلم دنیا کو اذیت دینے کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے نتیجے میں جو نفرت پیدا ہوئی تھی، اس نے یہودیوں کو بہت بڑے پیمانے پر موت کے گھاٹ اتارنے کا سامان کیا۔ جرمن نازیوں نے یہودیوں سے صدیوں کے دوران پلنے والی نفرت کے تحت انتقام لیا۔ اگر یہودیوں کا یہ دعویٰ درست بھی تسلیم کرلیا جائے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی جرمنوں کے ہاتھوں ۶۰ لاکھ یہودی موت کے گھاٹ اترے تھے تب بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں کو سب سے زیادہ نفرت کس سے ہونے چاہیے تھی؟ ظاہر ہے، جرمنوں سے۔ جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس ہے۔ مسلمانوں نے تو یہودیوں کو یوں سرعام نفرت کا نشانہ کبھی نہیں بنایا۔ یہودیوں کی نظر میں اگر انتقام لازم تھا تو پھر جرمنی کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جانا چاہیے تھا۔ جرمنوں کو سبق سکھانے کی ضرورت تھی مگر ہوا کچھ اور۔ مغربی قوتوں نے یہودیوں کو انصاف فراہم کرنے کے لیے مسلمانوں سے ناانصافی برتی اور یوں فلسطین کے سینے میں اسرائیل کے نام کا خنجر گھونپ دیا گیا۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ یہودیوں کو اسرائیل میں بسا کر فلسطینیوں کی شدید ترین حق تلفی کی گئی ہے۔ اب بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ پوری اسلامی دنیا اسرائیل کو تسلیم کرلے۔ اسرائیل کو جس طور قائم کیا گیا اور جس انداز سے اس ریاست نے مغرب کی سرپرستی میں فلسطینیوں سے شدید

ناانصافی روا رکھی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اسلامی دنیا اسرائیل سے نفرت کرے اور وہ ایسا ہی کرتی آئی ہے۔ عام یہودیوں سے مسلمان اب بھی نفرت نہیں کرتے۔ مغربی دنیا میں رہنے والے یہودیوں کو مسلمانوں سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی۔ دنیا بھر کے مسلمان اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسرائیل ایک سازش کے تحت معرض وجود میں لایا گیا ہے۔ اسرائیل کسی بھی طور برقرار نہیں رہ سکتا تھا مگر مغربی طاقتیں اُس کی پشت پناہ تھیں۔ امریکا اور یورپ نے مل کر اسرائیل کا وجود برقرار رکھنے پر توجہ دی ہے۔ اس کے لیے فلسطینیوں سے شدید ناانصافی ناگزیر سمجھی گئی تو ایسا ہی کیا گیا۔ اس کے باوجود کوشش یہی کی جاتی رہی کہ تمام مسلم ممالک اسرائیل کو دل وجاں سے تسلیم کرلیں۔

متحدہ عرب امارات نے اسرائیل سے دوستی اور تعاون کا جو معاہدہ کیا ہے وہ اس امر کا غماز ہے کہ بات چیت بہت پہلے سے جاری تھی۔ جب موقع آیا تو۔

آملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

جیسی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے کی تیاری بہت پہلے کرلی گئی تھی اور دوستی وتعاون کے معاہدے کے تمام نکات پر بھی رضامندی یقینی بنالی گئی تھی۔ متحدہ عرب امارات اور اسرائیل نے جس انداز سے ایک دوسرے کو گلے لگایا ہے وہ صاف بتارہا ہے کہ میدان بہت پہلے تیار کرلیا گیا تھا۔

سعودی عرب نے واضح طور پر اعلان کردیا ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ اعلان شدید دباؤ کا نتیجہ ہے۔ یہ دباؤ اندرونی یعنی اسلامی ممالک کی طرف سے ہے۔ سعودی عرب مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا حامل ہے اس لیے دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے انتہائی قابل احترام ہے۔ بیشتر مسلم ممالک ہر اہم معاملے میں سعودی عرب کی طرف دیکھتے ہیں۔ ایسا کرنا بالکل فطری ہے۔ بیشتر مسلم ممالک کی قیادت چاہتی ہے کہ سعودی عرب کی قیادت جو کچھ کرے وہی کچھ کیا جائے اُسی کے نقوشِ قدم پر چلا جائے۔ ایسا کرنے میں کچھ ہرج نہیں، اگر سعودی عرب صحیح راستے پر گامزن ہو۔ معاملات اس وقت پیچیدہ ہوجاتے ہیں، جب سعودی عرب سے اچھے اشارے نہیں آرہے ہوتے۔ سعودی قیادت کو بھی اس کا شدت سے احساس ہے۔

ایک زمانے سے مسلم ممالک مرکزی قیادت کے لیے ترس رہے ہیں۔ مسلم دنیا کی قیادت کس ملک کے ہاتھ میں ہونی چاہیے، یہ سوال بہت اہم رہا ہے۔ سعودی عرب اور ایران کی شکل میں مسلم دنیا دو بلاکس میں تقسیم رہی ہے۔ یہ بالکل سامنے کی بات ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ان دونوں کی رقابت نے کئی ممالک کو شدید ترین منفی اثرات سے دوچار رکھا ہے۔ پاکستان جیسے ممالک کے لیے یہ معاملہ بہت عجیب اور نقصاندہ رہا ہے۔ یہاں سعودی عرب کی حمایت کرنے والے بھی موجود ہیں اور ایران نواز عناصر بھی۔ ایسے میں معاشرے کا منقسم ہو رہنا فطری امر ہے۔ سعودی قیادت کی خواہش اور کوشش رہی ہے کہ باقی دنیا سے معاملات طے کرنے میں مسلم ممالک اس کی طرف دیکھیں، اس کی پالیسی کو اپنائیں۔ سعودی قیادت کا جھکاؤ مکمل طور پر مغربی طاقتوں کی طرف ہے۔ امریکا نے سعودی قیادت کو مٹھی میں لے رکھا ہے۔ اس کی تمام پالیسیوں پر امریکی اثرات بالکل نمایاں ہیں۔ دوسری طرف یورپ بھی سعودی عرب کو زیرِ تصرف رکھنے پر متوجہ رہتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ سعودی عرب پر اثر انداز ہو کر باقی اسلامی دنیا پر اثر انداز ہونا قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ مگر بنیادی سوال یہ ہے کہ سعودی قیادت کی پیروی کرنا ہر مسلم ملک کے لیے لازم ہے؟ اگر اس کی پالیسیاں اسلامی دنیا کے لیے مجموعی طور پر سود مند ہوں تب تو معاملہ ٹھیک ہے۔ بصورتِ دیگر سعودی قیادت کی پیروی کرنا بے عقلی اور خسارے کا سودا ہی سمجھا جائے گا۔

ڈیڑھ عشرے کی مدت میں ترکی تیزی سے ابھرا ہے۔ ترکی نے مسلم دنیا کی قیادت بھی کی ہے اور اب پھر ایسا کرنے کی کوشش میں ہے۔ اس وقت ترک قوم غیر معمولی اعتماد سے مالا مال ہے۔ ترکی نے یورپ کی طرز پر غیر معمولی ترقی یقینی بنا کر اسلامی دنیا کے سامنے خود کو مثال کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلم دنیا جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ ترکی نے جدید ترین علوم و فنون میں پیش رفت یقینی بنانے پر خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ یہ سب کچھ یورپ کی پیروی کرتے ہوئے ممکن ہو سکتا ہے۔ ترکی میں عمومی طرزِ رہائش یورپی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نے اپنی تہذیب اور اقدار کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ ترکوں کو اچھی طرح

اندازہ ہے کہ انہوں نے مسلم دنیا کی قیادت کی تھی اور اگر موقع ہاتھ آ جائے تو اس دور کو دہرانے کی بھرپور کوشش کی جا سکتی ہے۔ اور شاید وہ موقع آ چکا ہے۔

ترکی کے صدر رجب طیب اردگان ایک ایسے لیڈر بن کر ابھرے ہیں جو بعض اہم معاملات میں مغرب کی سوچ اور مرضی کو نظر انداز کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ اسرائیل کے معاملے میں انہوں نے یورپ کی ناراضی کی پروا نہیں کی اور محصور فلسطینیوں کی امداد کے حوالے سے ان کے اقدامات مسلم دنیا میں انتہائی استحسن کی نظر سے دیکھے گئے ہیں۔ بھارت کو کشمیر کے معاملے میں آنکھیں دکھانے کے معاملے میں بھی اردگان پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے متعدد مواقع پر پاکستان کے ساتھ کھڑے ہو کر باقی دنیا کو بتا دیا ہے کہ کسی بھی اہم معاملے پر پین اسلامک سوچ اپنائی جا سکتی ہے۔ فلسطینیوں اور کشمیریوں کے لیے آواز بلند کر کے رجب طیب اردگان نے ایران اور ملائیشیا کو بھی زبان دی ہے۔ ملائیشیا نسلی اعتبار سے منقسم معاشرہ ہے۔ وہاں غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ یہ ملک اب تک مجموعی طور پر خاصا پُرامن اور مستحکم رہا ہے۔ ملائیشین لیڈر مہاتر محمد نے کشمیر اور چند دوسرے معاملات میں بھارت سے ٹکرانے سے گریز نہیں کیا۔ یہ بہت حیرت انگیز بات ہے کیونکہ دونوں ممالک کے درمیان تجارت غیر معمولی نوعیت کی ہے۔ مہاتر محمد نے سویابین آئل کی برآمد کو داؤ پر لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ انہوں نے کشمیریوں کی حمایت میں نئی دہلی کو ناراض کرنے سے ذرہ بھر گریز نہیں کیا۔ اقوام متحدہ کے فورم سے بھی انہوں نے بھارت کو لتاڑنے میں بخل نہیں دکھایا۔ اس معاملے میں ان کے جذبات کو رجب طیب اردگان سے خاصی تحریک ملی ہے۔ ایران بھی ترکی اور ملائیشیا کا ہم نوا ہو کر ابھرا ہے۔ ان تینوں نے مسائل سے دوچار مسلم معاشروں اور زیادتی کا نشانہ بننے والی بڑی مسلم آبادیوں کے حقوق کی بات کر کے باقی دنیا کو بتا دیا ہے کہ اب معاملات کو جوں کا توں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ جلد یا بدیر، مسلم دنیا کے بنیادی مسائل حل کرنے ہی سے بات بنے گی۔ اور یہ کہ مغربی دنیا کو اسلامی ممالک یا مسلم اقلیتوں سے کھلواڑ جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

ترکی کا ابھرنا سعودی عرب کے لیے پریشان کن ہے کیونکہ اس کی نام نہاد قائدانہ حیثیت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ سعودی عرب نے اب تک مغربی پالیسیوں کے مقابل انتہائی بزدلانہ رویہ

اختیار کیا ہے۔ مسلم دنیا کو بہت سے اہم مواقع پر یہ توقع رہی کہ سعودی قیادت ان کے دل کی آواز بن کر ابھرے گی، دنیا بھر کے مسلمانوں کو درپیش مسائل کے حوالے سے مغرب سے دوٹوک انداز سے بات کرے گی مگر اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ ہر اہم موقع پر سعودی قیادت نے اپنے اور خطے کے مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ عطا کرنے پر توجہ مرکوز کی ہے۔ یہ روش مسلم دنیا میں تقسیم کا باعث بنی ہے۔ ایران اور ترکی نے مسلم دنیا کی آواز بن کر اپنی پوزیشن مستحکم کرلی ہے۔ یہ دونوں ممالک اب ملائیشیا کے ساتھ مل کر مغرب کو کسی حد تک منہ دے رہے ہیں، اور بھارت کو بھی۔ بھارتی قیادت اسلامی دنیا میں حق کے لیے آواز بلند کرنے کی طاقت رکھنے والے کسی بھی بلاک کے ابھرنے سے پریشان ہے۔ بھارت کے لاکھوں باشندے مسلم دنیا میں کام کر رہے ہیں۔ سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بحرین، قطر اور دیگر خلیجی ریاستوں میں بھارت کے لاکھوں مزدور، ہنرمند اور نالج ورکرز کام کر رہے ہیں۔ اگر ان ممالک میں ان کے لیے مجموعی طور پر مشکل حالات پیدا ہوگئے تو بھارتی معیشت کو غیر معمولی دھچکا لگے گا۔ بھارت میں مسلمانوں سے عمومی سطح پر زیادتیوں اور کشمیریوں سے خصوصی طور پر امتیازی سلوک روا رکھے جانے پر بھی عرب دنیا میں بسے ہوئے بھارتی باشندوں سے روا رکھے جانے حسن سلوک میں اب تک کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ بھارتی قیادت کو اِس خوش کن حقیقت کا بھی کچھ احساس نہیں۔ نئی دہلی کے پالیسی ساز یہ نہیں سوچ رہے کہ اگر عرب دنیا میں بھارتی باشندوں کے خلاف نفرت کی لہر اٹھ کھڑی ہوئی تو کیا ہوگا۔

وقت آگیا ہے کہ مسلم دنیا کے لیے کوئی ایک ملک پوری قوت کے ساتھ کھڑا ہو اور بھرپور قائدانہ کردار ادا کرے۔ ترکی، ایران اور ملائیشیا نے ایسی ہی کوشش کی ہے۔ چند ماہ قبل کوالالمپور میں منعقد کی جانے والی سربراہ کانفرنس اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ پاکستان نے اس کانفرنس میں شریک ہونے سے سعودی دباؤ کے باعث گریز کیا تھا۔ بعد میں عمران خان کو ملائیشیا جاکر وضاحت بھی کرنا پڑی تھی۔ یہ سب کچھ زیادہ نہیں چل سکتا۔ پاکستان کو اس حوالے سے کوئی حتمی نوعیت کو فیصلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ سی پیک سے جڑے منصوبوں کی بقا اور چین سے دیرپا دوستی برقرار رکھنے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر ہے۔

ترکی اور ایران نے مل کر ایسی فضا پیدا کردی ہے، جس میں بھارت اور دیگر علاقائی طاقتوں کے مفادات کو خطرات لاحق ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ چین کا اسلامی دنیا سے مجموعی تعلق بہت اچھا ہے۔ اس وقت کوئی ایک بھی مسلم ملک چینی مفادات کا یکسر مخالف نہیں۔ مغربی پروپیگنڈے کے باوجود مسلم دنیا میں چینی قیادت اور عام چینیوں کے لیے خیر سگالی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اور پھر جنوب مشرقی ایشیا سے ملائیشیا بھی مسلم دنیا کے لیے توانا آواز بن کر ابھرا ہے۔ مہاتر محمد نے پیرانہ سالی کے باوجود مسلم دنیا کے اتحاد کی خاطر متحرک رہنے کو ترجیح دی ہے۔ ایسے میں ترکی سے بہت زیادہ توقعات وابستہ رکھنا فطری امر ہے۔ ترکی مسلم دنیا کا قائد رہا ہے۔ ترکوں میں قائدانہ صفات بدرجۂ اُتم پائی جاتی ہیں۔ حالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ مسلم دنیا سعودی عرب پر دباؤ ڈالے کہ وہ بھی ترکی کا ہم نوا ہو۔ اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تب بھی مسلم ممالک کے پاس ترکی کی ہم نوائی کا آپشن ضرور موجود ہے۔ شمالی افریقا ایک زمانے سے امتیازی سلوک کا سامنا کر رہا ہے۔ عرب دنیا سے جڑے ہونے کے باوجود شمالی افریقا کے مسلم ممالک کو کچھ خاص ملا نہیں۔ سعودی عرب اور خلیج فارس کی متمول ریاستوں نے مسلم دنیا کے لیے مجموعی طور پر کوئی بڑا اقتصادی و سیاسی کردار ادا کرنے سے اب تک گریز کیا ہے۔ یہ سلسلہ اب زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ اگر مسلم دنیا کے بیشتر ممالک نے کوئی فیصلہ نہ کیا تو مزید خسارے سے دوچار ہوں گے۔ چین تیزی سے ابھر رہا ہے۔ اُس کے ابھرنے سے امریکا اور یورپ کے علاوہ بھارت جیسے ممالک بھی پریشان ہیں۔ بھارت اقتصادی طور پر اتنا مستحکم اب بھی نہیں کہ کسی بڑے دھچکے کو آسانی سے جھیل سکے۔ اگر امریکا اور یورپ نے راستہ بدل لیا تو سب سے زیادہ خسارے میں بھارت ہوگا۔

مسلم دنیا دوراہے پر کھڑی ہے۔ دنیا بدل رہی ہے۔ بدلتی دنیا کا ساتھ دینے کے لیے لازم ہوگیا ہے کہ مسلم دنیا کی ایک مضبوط مرکزی قیادت ہو۔ مسلم دنیا کو علاقائی قیادتوں کے ذریعے بھی مستحکم کیا جاسکتا ہے مگر یہ مستقل نوعیت کا حل نہیں۔ اگر اس وقت مسلم دنیا میں، کسی نہ کسی شکل میں، مضبوط مرکزی قیادت ابھر جائے تو چین کا حوصلہ بھی بڑھے گا اور وہ زیادہ قوت کے ساتھ امریکا اور یورپ کی برتری و اجارہ داری کا طلسم توڑنے کی سمت بڑھ سکے گا۔

نوجوان نسل

اپنی کمزوریوں پر کس طرح قابو پالے؟

نوجوان نسل کی کچھ کمزوریاں ایسی ہیں، جس نے اس کی زندگیوں کو تلخیوں سے بھر دیا ہے، وہ یہ ہیں: ہر مسئلہ کو عزت اور وقار کا مسئلہ بنانا، ضد کا ہونا، بزرگوں کی باتوں کا بُرا ماننا، رد عمل کی نفسیات کا ہونا، مزاج کا سخت ہونا، بڑے بڑے منصوبے بنانا، لیکن عمل کی صلاحیت کے فقدان کا ہونا، جوٹھی شان ومان کا ہونا، آرائش اور راحت کی جدید چیزوں سے محبت کا ہونا، دوستی کے تعلقات کو نبھانے کی صلاحیت کا نہ ہونا، جلد اشتعال اور غصہ میں آنا، معاملات کے سارے پہلوؤں پر غور وفکر کرکے صحیح لائین کا اختیار نہ ہونا، بزرگوں کے ادب وآداب کے سلیقہ سے آشنا نہ ہونا، قوت فیصلہ کی صلاحیت کا نہ ہونا، توجہ کا منتشر ہونا اور کسی بھی ایک مرکزی نکتہ پر توجہ کا نہ ہونا، گھر والوں کی نصیحت کی باتوں پر نالاں ہونا، ہر وقت غصہ کی حالت کا غالب ہونا، مزاج کے خلاف باتوں کو برداشت کرنے کی استعداد کا نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔

نوجوان نسل کو جو ماحول ملا ہے، وہ مادیت کا مسموم ماحول ہے، اس ماحول سے ہی ان کا یہ مزاج بنا ہے، نوجوان نسل کی اس حالت کو دیکھکر رونا آتا ہے کہ اس طرح کے حالات میں وہ بہتر، خوشگوار اور کامیاب زندگی کیسے گزار سکیں گے، پچھلے دنوں ایک معمولی بات پر وکلا اور ڈاکٹروں کے درمیاں تکرار ہوا، جس سے کئی اموات واقع ہوئیں۔

نوجوان نسل کو ہمت اور حوصلہ سے کام لے کر، اپنے اس مزاج کو بدلنے کی ضرورت ہے، اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ وہ روزانہ کم از کم دس پندرہ منٹ کے لئے اپنے اندر میں غوطہ زنی کرکے، اپنی اصلیت اور اپنی حقیقت پر غور کریں، انسانی شخصیت کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ وہ مٹی کی تخلیق ہے اور اس

کا جسمانی نظام مر کر مٹی کا حصہ بن جائے گا، مٹی کے حامل انسان کی عزت اور شان ومان کیا ہو سکتی ہے، انہیں اس پہلو پر غور کرنا چاہیے، اس پر غور وفکر سے مزاج میں عاجزی اور خاکساری پیدا ہوگی۔

انسان کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ اس میں دل اور روح کی جوہری صلاحیتیں موجود ہیں، دل اور روح ہر وقت محبوب حقیقی سے وصال کے لئے مضطرب رہتے ہیں، اپنے اندر میں ڈوبتے رہنے سے دل اور روح کو ان کی اصل غذا ملے گی، جس سے سکینت پیدا ہوگی اور مزاج میں ٹھہراؤ آئے گا۔

نفسیات کی درستگی
کے عمل کی بہتر صورت

جدید نسلیں ذہنی اور نفسیاتی طور پر بہت سارے مسائل کا شکار ہیں، ان مسائل کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انہیں مثبت اور صحتمند ماحول میسر نہیں، انہیں جو ماحول میسر ہے، وہ منفی اور خالص مادی نوعیت کا ماحول ہے، مادی نوعیت کے اس ماحول سے ان کے دل و دماغ اور نفسیات میں ظلمات اور تاریکی کے اثرات منتقل ہو رہے ہیں، جس سے دل، روح، ذہن اور نفسیات میں فساد برپا ہونے لگتا ہے، وسوسوں کا ہجوم، چڑچڑا پن، زندگی سے بیزاری، احساس تنہائی، اور مایوسی جیسی حالتیں پیدا ہو رہی ہیں، اس طرح ان کی نفسیات میں زہر سرایت کر جاتا ہے، نوجوان نسل کی یہ حالت ایسی ہے، جس پر خون کے آنسوں ہی بہائے جا سکتے ہیں۔

اس صورتحال سے بچاؤ کی سب سے بہتر اور مؤثر صورت یہ ہے کہ صحتمند سوچ کے حامل افراد کی صحبت اختیار کی جائے، تاکہ مزاج، نفسیات اور ذہن میں مثبت اور پاکیزہ خیالات و احساسات کی لہروں کی منتقلی کا عمل شروع ہو سکے اور ظلمات کی جگہ پاکیزہ احساسات داخل ہو سکیں، صحبت، انسانی شخصیت پر سب سے زیادہ اثرانداز ہوتی ہے۔

یہ نکتہ سمجھنا از حد ضروری ہے کہ ہمیں صبح سے لے کر رات تک جن افراد سے بھی واسطہ پڑتا ہے، وہ عام طور حب مال اور حب جاہ کے جذبات سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور ان پر فاسد جذبات غالب ہوتے ہیں، اس طرح کے افراد طاقتور منفی شعائیں رکھتے ہیں، ہمارے نہ چاہنے کے باوجود یہ منفی شعائیں ہمارے دلوں میں منتقل کرتے رہتے ہیں، جس سے ہمارے خیالات، احساسات اور جذبات میں ناپاکیزگی کے اجزاء غالب ہونے لگتے ہیں، بالکل اس بے پردہ حسین عورت کی طرح، جس کی طرف دیکھتے رہنے سے ذہن خلجان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

منفی خیالات کی ان لہروں کی روک تھام اور اپنی شخصیت میں پاکیزہ خیالات کی لہروں کو داخل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ طاقتور پاکیزہ خیالات کے حامل افراد کی صحبت اختیار کی جائے، اس سے دل دماغ، روح، نفسیات اور مزاج میں پاکیزہ احساسات اور طاقتور صحتمند شعاؤں کی منتقلی کا عمل شروع ہوتا ہے۔ جس سے شخصیت صحتمند سوچ کی حامل ہو جاتی ہے اور دماغی دباؤ ختم ہو جاتا ہے اور نفسیات کی درستگی کی صورت پیدا ہوتی ہے اور شخصیت میں ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے۔

روحانی مسرت کی زندگی کی اہمیت

ہماری نوجوان نسل مادیت کے ہمہ گیر طوفان کی زد میں ہے، ایسا طوفان جو ہر وقت نفسی جذبات کو ابھارتا اور مشتعل کرتا رہتا ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مغرب سے مادیت پرستی کی جو طوفانی لہر اٹھی ہے، اس نے ہماری نوجوان نسل کو زیروزبر کر دیا ہے اور اپنی پاکیزہ تہذیب سے دستکش کر کے، مادیت اور مادی زندگی کو نصب العین کی حیثیت دینے پر ابھارا ہے۔

ان حالات میں ضرورت ہے کہ نوجوان نسل کے لئے صحیح ذہنی اور فکری خطوط اور صحیح تربیت کے نقوش متعین کئے جائیں، اور انہیں دعوت دی جائے کہ اگر وہ مادیت کی بے رحم طوفانی لہروں سے بچکر ذہنی، نفسیاتی اور اعصابی بیماریوں سے تحفظ چاہتے ہیں اور روحانی اور وجدانی طور پر استحکام چاہتے ہیں تو انہیں خدا پرستی پر مبنی روحانیت کی راہ اختیار کرنی ہوگی، جس میں ان کی دنیا وآخرت کی زندگی کی سلامتی اور بہتری کی ضمانت ہے۔

مادی زندگی کو نصب العین بنا کر اپنی ساری ذہنی و عملی صلاحیتیں اور توانائیاں اس میں خرچ کرنا، یہ دراصل اپنے آپ کو نفس پرستی کی قوتوں کے حوالے کرنا ہے، جس کی سزا فکری انتشار، ذہنی دباؤ، حرص وہوس کے بتوں کی پرستش اور ساری انسانی شخصیت کو مریض بنانے کے علاوہ دوسری کوئی نہیں ہوسکتی، نفس کی وقتی لذتوں کی قیمت پر دل اور روح جیسی جوہری قوتوں کی بربادی کا فیصلہ نادانی ہے، نادانی۔

مغرب کی تقلید میں مادیت پرستی کی راہ پر گامزن ہونا اور مادی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھنا، اس کی جو سزا اہل مغرب کو بھگتنا پڑ رہی ہے کہ ہر محلہ میں نفسیاتی ماہروں کی اسپتالیں قائم ہوگئی ہیں، ہماری نوجوان نسل کو اس سزا کے لئے تیار ہونا ہوگا۔

ہماری پاکیزہ تہذیب میں صدیوں سے دل اور روح کو مستحکم کر کے، ساری انسانی شخصیت کو متوازن بنانے اور زندگی کو حقیقی مسرت وحلاوت سے سرشار کرنے کا انتظام رہا ہے، وجدانی اور روحانی حلاوت کی یہ زندگی ایسی ہے، جس پر سو مادی زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں اور مادیت کے نشہ سے آسانی سے بچا جاسکتا ہے۔

خدا پرستی پر مبنی روحانیت کا ہمارا یہ سلسلہ اسلامی تہذیب ہی کا حصہ ہے، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

زندگی کے رخ کو بہتر سمت میں موڑنے کی ضرورت

موجودہ دور ایسا ہے، جس میں نفسانی قوتیں روحانی قوتوں پر پوری طرح غالب آگئی ہیں، جس کی وجہ سے حساسیت پیدا ہوگئی ہے اور احساس کی نزاکت کی وجہ سے چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ بھی فرد پر بجلی بن کر گرتا ہے اور فرد اضطراب کے انگاروں پر لیٹنے لگتا ہے، احساس کی اسی نزاکت سے ذہنی، نفسیاتی، اعصابی اور وجدانی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور معاشرہ میں ٹوٹ پھوٹ اور فساد برپا ہوتا ہے۔

چونکہ فضا میں مادہ پرستی کا زہر موجود ہے، اس لئے نفسی قوتیں بے قابو ہو رہی ہیں، نفسی قوتوں کے بے قابو ہونے کی وجہ سے مزاج کے زیروزبر ہونے اور احساس کے ناپاکیزہ ہونے کے سنگین مسئلہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اس صورتحال کو بدلنے کی ایک ہی صورت ہے کہ نفسی قوتوں پر روحانی قوتوں کو غالب کرنے کی کوشش ہو۔ دوسری صورت میں علم، ذہانت اور دولت ومنصب کے باوجود فرد کے احساسات میں رنج، غم، دکھ، اذیت، اشتعال اور بے یقینی کے اجزاء غالب ہوں گے اور زندگی ہر طرح کے فساد سے عبارت ہوجائے گی۔

نفسی قوتوں کو مفتوح بنانے اور روحانی قوتوں کو بیدار کرنے کا عمل دشوار ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں، اس کے لئے صحبت اور دوستی کے ماحول کو بدلنے کی ضرورت ہے، صحبت کے بہتر اور پاکیزہ ماحول سے از خود مثبت شعائیں منتقل ہونا شروع ہوجائیں گی، جس سے منفی عادتوں کی جگہ بہتر عادتیں پیدا ہوتی جائیں گی اور روحانیت کی راہ پر گامزن ہونے میں ہمت وحوصلہ پیدا ہوتا جائے گا۔

یاد رکھیں کہ نفسی قوتوں کے غلبہ کی وجہ سے دنیا وآخرت دونوں کے خسارہ کا سودہ ہے، دنیا میں خوف وہراس، بے یقینی کی فضا، ذہنی ونفسیاتی بیماریاں اور حرص وہوس کے جذبات بے قابو ہوں گے تو آخرت میں اللہ کے شدید عتاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ دونوں جہانوں کے خسارہ کے مراقبہ سے بھی زندگی کا رخ بہتر سمت میں بدلنے میں مدد مل سکتی ہے۔

نفس کی قوت کو سمجھنے اور اسے مہذب بنانے کی ضرورت

اگر علم، ذہانت اور عقل کے غیر معمولی استعمال کے باوجود فرد پر اشتعال، ضد، دوسروں کی تحقیر، اپنی رائے کو ہر صورت میں دوسروں پر مسلط کرنے، بحث مباحثہ کرتے رہنے، چڑچڑاپن، سکون سے محرومی، عدم برداشت اور انانیت جیسے جذبات غالب ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہیں کہ فرد کا دل خالی ہے اور وہ باطن کی وسیع دنیا سے آشنا نہیں ہے اور اس کا علم اسے علمی برتری کی راہ پر گامزن کرنے کا باعث بن رہا ہے، اس صورت میں فرد اپنی ذات اور معاشرے کو خیر و بھلائی سے بہرہ ور کرنے کی بجائے اس میں افتراق پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے گا، اور نہ چاہتے ہوئے بھی فرد اس راہ پر گامزن ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔

علم، ذہانت اور عقلی صلاحیتیں اگرچہ اللہ کا انعام ہیں، لیکن یہ نعمتیں جب دل اور روح کی صلاحیتوں کو جلا دینے کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوں تو اس صورت میں شخصیت پر نفسی قوتیں حاوی ہو جاتی ہیں، جو علم اور عقل کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر کے، فرد کو حق اور حقیقت کی گہرائیوں سے ناآشنا کر دیتی ہیں اور دل اور روحانیت کے صاحبوں سے دور کر دیتی ہیں اور باطن کی وسیع دنیا کے حوالے سے باتیں سننے سے طبیعت کو مکدر کر دیتی ہیں۔

خوشی، مسرت، حلاوت، نرمی، رواداری، محبت، عاجزی، عاجزانہ روش، سب کے ساتھ احساسِ اپنائیت، ردعمل کی نفسیات سے بچاؤ، دوسروں کی الٹی سیدھی باتوں کو برداشت کرنا وغیرہ یہ ساری خصوصیات ایسی ہیں، جو علمی و ذہنی برتری اور ضد کی نفسیات کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکتیں، اس کے لئے ضروری ہے کہ فرد اپنی ہر طرح کی برتری سے دستبردار ہو کر، اپنی شخصیت میں موجود فرعون نفس کو سمجھنے اور اس کی اصلاح کے کام کو اولین ترجیح دے، علم اور ذہانت اس کے بعد ہی کارگر اور مفید ثابت ہو سکتی ہے، ایسا نہ کرنے کی سزا یہ ہے کہ فرد کو ساری عمر ضد، بحث و مباحثہ، اہل

اللہ پر تنقید اور علمی گتھیاں سلجھانے کی راہ پر لگا دیا جاتا ہے، فرعون نفس محض جاننے، باتیں سننے یا باتیں سنانے سے مہذب نہیں ہوتا، اسے ذکر و فکر کے مجاہدوں میں لانے کی ضرورت لاحق ہے اور اہل اللہ کی صحبت کی بھی۔ اس نکتہ کو سمجھنے میں جتنی تاخیر ہو گی، نفسی قوتیں اسی حساب سے مستحکم سے مستحکم تر ہوتی جائیں گی، سنبھلنے اور بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔

انسانی نفس کی نوعیت کو سمجھے بغیر علوم کا بے نتیجہ ہونا

اس وقت انسانیت محلہ کی سطح سے لے کر عالمی سطح تک جس بحران سے دوچار ہے، وہ نفسی قوتوں کو نہ سمجھنے اور اس قوت کو مہذب نہ بنانے کا بحران ہے، حضرت مجدد الف ثانی کا مقولہ ہے کہ نفس اپنی الوھیت سے کم پر راضی نہیں۔ آپ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ نفسی قوتوں کی فنائیت سے پہلے فرد کا نفس شیطان سے زیادہ شریر ہے۔ حضرت مجدد ہی نہیں، بلکہ سارے بزرگان دین نے نفسی قوتوں اور نفس کے بارے میں اس طرح کے انتباہات دیئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی شخصیت میں روح جیسے لطیف جوہر کے ساتھ سارے درندوں سے بڑھکر خوفناک قوت نفس کی صورت میں رکھی ہے اور یہ آزمائش کی خاطر ہے کہ انسان اسے مطیع کرنے اور مہذب بنانے میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہے۔ دنیا میں موجود سارا فساد دراصل اسی نفس کی شہ زوری اور کارستانی کا نتیجہ ہے، قوموں اور ملکوں میں بدامنی ہو یا سیاست، معیشت اور معاشرت میں پیدا ہونے والی ہمہ جہتی نوعیت کی خرابیاں، یہ سب نفسی خواہشات کے بے لگام ہونے کا نتیجہ ہیں۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ ہر فرد رو رہا ہے کہ سکون اور خوشی کی زندگی سلب ہوگئی ہے، محبت ورواداری ختم ہوگئی ہے، انسان نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی، مفادات کی جنگ ہے، جو ہر جگہ برپا ہے۔

یہ ساری صورتحال نفسی قوتوں کی عدم معرفت، اس کے عدم فہم اور اسے مہذب بنانے کے کام سے انکاری روش ہی کا نتیجہ ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ساری تلاش و تحقیق کو روک کر، انسان کو انسان بنانے اور اسے انسان کی حیثیت سے مہذب زندگی گزارنے جیسے سب سے زیادہ اہم اور اولین کام پر صلاحیتیں صرف ہوتیں اور تعلیم وتربیت کا سارا نظام نفس کی سرکش قوتوں کو قابو کرنے کے مرکزی نکتہ کے گرد بنایا جاتا، لیکن اس کام کو عالمی سطح سے لے کر محلہ کی سطح تک کوئی اہمیت نہیں دی جارہی، ساری صلاحیتیں اور توانائیاں انسانی شخصیت کے مادی وجود کو تقویت دینے کے مقصد میں صرف کی جارہی ہیں۔

معرفت نفس کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ فرد دوسروں کو اپنی نفسی خرابیوں سے بچانے کے لئے کوشاں ہو، نیز اس کے حب جاہ، حب مال اور حرص وہوس کے جذبات سے دوسرے انسان پامال نہ ہونے پائیں۔

جب تک انسانیت معرفت نفس اور تزکیہ نفس کی طرف نہیں آئے گی، تب تک وہ نئے نئے بحرانوں سے دوچار ہوتی رہے گی اور انسانیت کی قوتیں ایک دوسرے سے ٹکرانے میں صرف ہوتی رہیں گی۔

نوجوان نسل کی اہمیت اور اس کی صلاحیتوں

کے بہتر استعمال کی صورت

کسی بھی قوم وملت کا اصل سرمایہ اس کی نوجوان نسل ہوتی ہے، جو اس کی تہذیب اور اقدار کی امین ہوتی ہے اور جو اپنی قوم وملت کے تسلسل کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے تہذیبی تسلسل کو بھی قائم رکھتی ہے، اس اعتبار سے نوجوان نسل کی اہمیت مسلمہ ہے۔

ہماری تہذیب ایسی ہے، جو صدیوں تک انسانوں کی رہنمائی کرتی رہی ہے، انسانیت کو علوم وفنون اور سلیقہ انسانیت سے آشنا کرنے میں ہماری پاکیزہ تہذیب کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی بڑی المناک بات ہے کہ تاریخ میں پہلی بار ہماری نوجوان نسل اپنی تہذیب سے دستکش ہو کر، مادی تہذیب کی اسیر ہوتی جارہی ہے۔

جس کے زیر اثر جسم کو راحت کا سامان فراہم کرنے اور دولت کی حرص وہوس کے جذبات کی تسکین کے لئے ذہن وجسم کی ساری توانائیاں صرف کی جارہی ہیں، جب زندگی پاکیزہ مقصد سے خالی ہوتی ہے اور مادی مقصد سارے پاکیزہ جذبات پر غالب ہوتا ہے تو انسان کی حیثیت ترقی یافتہ جانور سے مختلف نہیں ہوتی، حیوان بھی کھاتا ہے، پیتا ہے اور سو کر زندگی گذارتا ہے، اگر انسان کا مقصد بھی کھانے پینے اور لذت کی چیزوں سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا نہ ہو تو پھر انسان اور جانور میں فرق ہی کیا ہوا، جدید مادی نظریات میں تو انسان کی ایک توجیہ ترقی یافتہ حیوان ہی کی گئی ہے۔ ماہر نفسیات میگڈوکل جسے مغرب میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اس کا کہنا ہے کہ انسان فطری طور پر سب سے بڑا تقاضا جو لے کر آتا ہے، جسے انسان کا نصب العینی تقاضا کہا جائے گا، وہ حیوانی جبلت اور حیوانی تقاضا ہے، لیکن اسلامی تہذیب میں انسان کو اشرف المخلوقات کی حیثیت دی گئی ہے، یہ ساری کائنات اس کے استفادہ کے لئے بنائی گئی ہے اور وہ خود جوہری مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے، وہ مقصد اللہ کی عبادت اور اس کی معرفت ہے۔

نوجوان نسل اگر اس نکتہ کو سمجھکر اسے فیصلہ کن اہمیت دے اور اپنی زندگی کو اپنی پاکیزہ تہذیب کا نمونہ بنائے تو وہ غیر معمولی روحانی توانائی کی حامل ہو جائے گی، اور وہ جدید انسان کی رہنمائی کرنے کے قابل بھی۔

آیئے عہد کریں

عید کے موقعہ پر ہمارا پیام یہ ہے کہ رمضان میں ہم نے جو تھوڑی بہت روحانی توانائی حاصل کی ہے، اس کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں، اپنے دل کو دوسروں کے بارے میں بدگمانی، نفرت اور حسدہ وغیرہ سے بچانا چاہیئے اور دل کو صاف رکھنا چاہیے، دوسروں سے عزت وتکریم سے پیش آنا چاہیئے، اللہ کے بندوں کو اپنے آپ سے بہتر اور افضل سمجھنا چاہیے، ایسا کرنے سے جہاں اللہ کی نظر میں آپ کا رتبہ بلند ہوگا، وہاں اس سے خوشگوار زندگی کی سعادت بھی حاصل ہوگی۔

یاد رکھیں کہ اللہ کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کی دلجوئی اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا ایسا کام ہے، جو سعادت دارین کی حیثیت رکھتا ہے۔

کینہ، نفرت اور جلن کے حامل فرد کے دل میں اللہ کے انوار داخل نہیں ہو سکتے، اس لئے انسانوں سے محبت کے معاملے کو ہمیں اپنی زندگی کی ترجیح میں اولیت کا مقام دینا چاہیئے۔

ہماری اس روش سے معاشرہ اور خاندان ٹوٹ پھوٹ سے بچ کر، وحدت کے رشتے میں منسلک ہو سکتے ہیں، اسی وحدت سے امت طاقتور ہوگی۔

ایک اہل اللہ کا ذکر ہے کہ ایک صاحب دور دراز سے مسافت کر کے، ان سے ذکر لینے کے لیے آئے، بزرگ نے ان سے کہا کہ تمہارا پہلا سبق یہ ہے کہ اپنے دل کو لوگوں کے بارے میں پاک وصاف کر لو، اور سب کو اپنے سے بہتر سمجھو اور اس سلسلے میں خود احتسابی سے کام لو۔ وہ مرید چند ہفتوں کے بعد سے پھر آیا اور کہا کہ میں ذکر لینے کے لئے آیا ہوں، بزرگ نے کہا کہ میں نے جو پہلا سبق دیا تھا، اسے پکا کر لیا، اس نے نفی میں جواب دیا۔اس پر بزرگ نے کہا کہ جب پہلا ہی سبق پکا نہ ہو تو دوسرا سبق کیسے دیا جائے؟

بزرگوں کے ہاں دوسروں کو اذیت پہنچانا بُرے کاموں میں شمار ہوتا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء کی کتاب ''فوائد الفوائد''میں ایک ملفوظ ہے، آپ فرماتے ہیں کہ بُرا کہنا بُرا ہے، لیکن بُرا سمجھنا اس سے زیادہ بُرا ہے۔

حکیم الامت فرماتے ہیں تصوف کل کا کل یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو نقصان پہنچنے سے بچا جائے۔

لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ سے تعلق مستحکم کیئے بغیر اللہ کے بندوں کو اپنی نفس کی شرارتوں سے بچانا اور ان سے بے غرضانہ تعلقات استوار کرنے کی صلاحیت کا پیدا ہونا دشوار بات ہے، اس کے لئے مخلصانہ عبادت اور ذکر وفکر کی ضرورت ہے، اس سے روحانی قوتیں، نفسی قوتوں پر غالب آنا شروع ہوتی ہیں اور اللہ کے بندوں سے محبت پیدا ہوتی ہے۔

معاشی جدوجہد میں توازن کی ضرورت

اور اس کے فوائد و ثمرات

دنیا میں رہنا ہے تو مادی ضروریات سے مفر ممکن نہیں، فرد کو روٹی چاہیے، مکان چاہیے، سواری چاہیے، زندگی کی کم سے کم سہولتیں ہیں، علاج کے لئے وسائل ہیں، اس حد تک مادی ضروریات اور مادی وسائل کے حصول کی جدوجہد ناگزیر ہے، اسلامی نقطہ نگاہ سے معاش کے لئے اور اتنے مادی سامان کے لئے جدوجہد فرائض میں شامل ہے، لیکن اس سلسلہ میں اتنی احتیاط ضروری ہے کہ ایک تو ساری ذہنی صلاحیتیں معاشی جدوجہد اور نئی نئی ضروریات کی تکمیل کے لئے صرف نہ ہوں، دوسرے یہ کہ عبادت اور ذکر وفکر کے لئے کچھ نہ کچھ وقت نکالنا ضروری ہے، زیادہ نہیں تو ایک دو گھنٹے ذکر وفکر کے لئے ضرور مخصوص ہونے چاہیے۔

اس سے جو فوائد حاصل ہوں گے، وہ بہت زیادہ ہیں، ایک یہ کہ روزی کی جدوجہد میں برکت شامل حال ہو جائے گی، کم آمدنی سے بھی زیادہ ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ وسائل میں برکت عطا فرمائے گا۔ قرآن میں ہے **’’ومن یتق اللہ یجعل لہ من امرہ یسریٰ‘‘** (جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اس کے کاموں میں آسانی پیدا کرتا ہے)۔

ذکر وفکر کے لئے وقت نکالنے سے دوسرا بڑا فائدہ جو حاصل ہوگا، وہ یہ ہے کہ فرد ہر طرح کے ذہنی دباؤ، فکری انتشار اور مادیت کی بے رحم موجوں کے تھپیڑوں سے زیر وزبر ہونے سے بچ جائے گا اور وہ صبر وشکر کی نفسیات کا حامل ہو جائے گا۔

تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ دل اور روح کو ذکر وفکر اور مخلصانہ عبادت کی جب غذا ملنا شروع ہوگی تو ان کی تسکین اور طمانیت میں غیر معمولی اضافہ ہوگا، جس سے انسانی شخصیت میں ٹھہراؤ آجائے گا۔

اس طرح کے کئی فوائد ہیں، جو معاش کی جدوجہد کو مسلط نہ کرنے، اس میں توازن پیدا کرنے اور عبادت اور ذکر وفکر کے لئے وقت نکالنے سے حاصل ہوں گے۔

موجودہ دور میں جب کہ ہر فرد سخت ذہنی دباؤ کا شکار ہے اور نئے نئے مصائب نے ان کا سخت گھیراؤ کیا ہے، ایسے حالات میں ذکر وفکر کے لئے وقت نکالنے کے یہ فوائد کوئی کم فوائد نہیں ہیں، قلبی سکون کی نعمت ایسی ہے، جو سب سے بڑی نعمت ہے، دنیا کی ساری دولت خرچ کرنے سے بھی یہ نعمت عظمیٰ حاصل نہیں ہوسکتی۔

سکون کی تلاش اور اس کی حقیقی صورت

دنیا میں انسان کی سب سے بڑی ضرورت سکون اور خوشی کی زندگی ہے، ہر انسان سکون اور خوشی کی زندگی کا متلاشی ہے، عام طور پر افراد کو یہ غلط فہمی لاحق ہوتی ہے کہ انہیں سکون اور خوشی کی زندگی دولت اور مادی راحت کے سامان سے حاصل ہوگی، اس لئے افراد دولت کے حصول کی جدوجہد میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیتے ہیں، لیکن جوں جوں دولت آنے لگتی ہے، اسی حساب سے بے سکونی اور بے چینی میں اضافہ ہونے لگتا ہے اور دولت کی مزید حرص اور دولت سے مزید دولت بنانے اور اس دولت کی حفاظت اور اس میں کمی واقع ہونے کے تفکرات بھی گھیر لیتے ہیں۔

جہاں تک بنیادی ضروریات کے لئے دولت کے حصول کے لئے جدوجہد کا تعلق ہے وہ تو ناگزیر ہے اور اتنی دولت نہ ہونے سے بھی بے قراری کا پیدا ہونا ایک حد تک فطری بات ہے، لیکن حقیقی سکون اور حقیقی خوشی کی زندگی کا تعلق دراصل دل اور روح سے ہے، دل اور روح جوہری چیزیں ہیں، ان کی تشفی محبوب حقیقی کے انوار حسن کے مشاہدہ کے بغیر نہیں ہوسکتی، جب دل اور روح کو ذکر وفکر کی قابل ذکر خوراک ملتی ہے، تو وہ دکھ، غم اور اذیت کے بے پناہ احساسات سے محفوظ ہو جاتے ہیں، چونکہ جسمانی نظام روح کے تابع ہوتا ہے، اس لئے روح اپنی خوشی، حلاوت اور سکینت کے اجزاء پورے جسمانی نظام کو منتقل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے، اس طرح روح کو توانائی ملنے سے وہ فقر، زہد اور دنیا کے اپنے کم سے کم حصہ پر راضی ہونے لگتا ہے۔

سکون کی تلاش بذریعہ مادی سامان، سکون کی تلاش بذریعہ دولت یہ دراصل نفس کا فریب ہے، اس طرح نفس، فرد وافراد کو ساری زندگی مادی دنیا میں مصروف رکھکر، ایک تو حقیقی خوشی سے محروم رکھنے کا ذریعہ بنتا ہے، دوسرے یہ کہ وہ فرد کا روح سے رشتہ منقطع کر کے، اسے اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔

روح اس دنیا میں بھی محبوب حقیقی سے وصال کی آرزومند ہے، تو آخرت میں تو وہ محبوب کو ایک نظر دیکھے بغیر رہ نہیں سکے گی، اُس وقت جب مادہ پرست فرد کو یہ دھمکی ملے گی کہ میں ان سے نہ تو کلام کروں گا، نہ انہیں دیکھوں گا اور نہ ہی انکا تزکیہ کروں گا تو یہ دھمکی دراصل کئی جہنموں پر بھاری ہوگی۔

یہ کتنے بڑے خسارہ کا سودہ ہے، جو فریب نفس کو نہ سمجھنے اور مادہ پرست افراد کے دوستی ماحول کی وجہ سے ہوتا ہے۔

دنیا اور دولت پر ٹوٹ پڑنے کا میلان اور رجحان ویسے بھی انسانی شرف اور مردانگی کے منافی ہے، اس میلان سے بچنے کے لئے تزکیہ ضروری ہے، تزکیہ ہی فلاح اور نجات کی راہ ہے، تزکیہ کا مفہوم ہے نفس کو مادی نوعیت کے گند سے پاک وصاف کرنا۔

نفس جب تک پاکیزگی کے مراحل سے نہیں گزرتا، تب تک وہ نہ تو نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ محبوب حقیقی کی معیت اختیار کرنے میں روح کا ساتھ دے سکتا ہے۔

اللہ کی محبت اور سچی روحانیت کو

عقل کے ذریعہ سمجھنے کے نتائج

وہ افراد قابل رحم ہیں، جو فطرت سلیمہ کی حفاظت نہ ہونے کے بعد اللہ کی محبت، اللہ سے عشق، اس کی معرفت، سچی روحانیت اور تزکیہ کی باتوں کو عقل کے ذریعہ سمجھنا چاہتے ہیں یا گفتگو کے ذریعہ ان کا ادراک حاصل کرنا چاہتے ہیں، تزکیہ اور اللہ سے محبت اور اس کی معرفت یہ دین کے مقاصد میں شامل ہیں، جب فرد زیادہ دیر تک ان چیزوں سے دوری اختیار کرتا ہے یا علمی وذہنی برتری کی وجہ سے اپنی خاص نفسیات بنالیتا ہے تو پھر ہوتا یہ ہے کہ سچی روحانیت اور اللہ کی محبت ومعرفت کی راہ میں حجابات پیدا ہو جاتے ہیں، یہ حجابات فرد کو دین کے ان نصب العینی چیزوں کے فہم سے قاصر بنادیتے ہیں۔

فرد صبر وشکر، رحم دلی اور اخلاق حسنہ وغیرہ سے محروم ہونے کے باوجود ضد کی نفسیات کا حامل ہو جاتا ہے اور بضد ہوتا ہے کہ اسے عقل واستدلال کے پیمانہ سے روحانیت اور معرفت کی حقیقت سمجھائی جائے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عقل اور الفاظ کا دائرہ اتنا محدود اور تنگ ہے کہ اس کے ذریعہ سے معرفت اور روح کی گہرائیوں تک پہنچنا ممکن نہیں، معرفت ہو یا سچی روحانیت یا تزکیہ ہو، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جن کے لئے عقل اور استدلال سے عجز کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے یا عقل سے کچھ عرصہ کے لئے دستبرداری اختیار کرنی پڑتی ہے۔

بُرا ہو ذہنی اور علمی برتری کا کہ وہ فرد کے لئے محبوب حقیقی کی محبت کی راہ پر گامزن ہونے سے روکنے کے لئے استدلال کا انبار لاکھڑا کر دیتی ہے، اس طرح فرد وافراد زندگی بھر لچھے دار گفتگو اور علمی وذہنی برتری کی وجہ سے اللہ کی معرفت اور سچی روحانیت سے محروم رہتا ہے اور قلبی سکون کے لئے ترستا رہتا ہے اور عام طور پر اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ دنیا بھر کی معلومات کے باوجود مزاج کے خلاف معمولی واقعہ بھی اس کو بے قرار کر دیتا ہے، اور وہ صبر وشکر تحمل وبردباری جیسے اوصاف سے محروم رہتا ہے۔

بزرگان دین کے علوم سے عدم آشنائی کی شکایت

اورشناسائی کی صورت

بزرگان دین کے علوم جو قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں، ان علوم میں گہرائی ہونے اور نفس پرستی کی قوتوں کا گہرا فہم ہونے کی وجہ سے ان کے یہ علوم عام طور پر ہمیں سمجھ میں نہیں آتے، ان کے یہ علوم دراصل آتش عشق میں جلنے کا نتیجہ ہوتے ہیں، چونکہ ہمارا نفس اور نفسی قوتیں توانا ہوتی ہیں، اس لئے ہمیں شکایت ہوتی ہے کہ بزرگوں کے بیان کردہ نکات یا ان کے نفس پرستی کی قوتوں کو مطیع کرنے کے علوم ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک نفسی حجابات اور نفسی کدورتیں غالب ہیں، تب تک دل اور روح کی نزاکتوں کا فہم اور نفس مطمئنہ کی نوعیت کو سمجھنا دشوار ہی نہیں، بلکہ دشوار تر ہے۔

بزرگوں کے علوم چونکہ نفس کو تزکیہ کے مراحل سے گزار کر، نفس مطمئنہ تک پہنچانے اور دل اور روح کو اللہ کی محبت سے سرشار کرنے سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم ان چیزوں سے عملی طور پر دور ہیں، ہمیں کتابی علم اور استدلال سے گفتگو کرنے کا ڈھنگ تو آتا ہے، لیکن ہم اللہ کے نور سے دیکھنے کی صلاحیت سے قاصر ہیں، حدیث شریف ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرا کرو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

ہم اگر چاہتے ہیں کہ بزرگوں کے علوم اور ان کی حقیقی نوعیت کو سمجھ سکیں اور لاکھوں بزرگان دین کے بیان کردہ نکات کا فہم حاصل سکیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کی محبت اور سچی معرفت کے لئے اپنے اندر میں حقیقی اضطراب پیدا کریں، جب یہ حقیقی اضطراب پیدا ہوگا تو ہم نفس پرستی کی قوتوں سے معرکہ آرائی کی راہ اختیار کر سکیں گے، اس طرح ہمیں حب جاہ، حب مال، حرص، حسد، جلن، خود نمائی اور خود ثنائی جیسے بے پناہ جذبات سے واسطہ پڑے گا اور عرصہ تک ان قوتوں کا مشاہدہ ہوتا رہے گا، جب نفسی حجابات دور ہونا شروع ہوں گے تو اللہ کے نور سے دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی جائے گی، اور اس کے بعد ہی بزرگوں کے علوم کی حقیقت ہم پر واضح ہوگی اور قرآن وسنت میں موجود نور تک رسائی حاصل ہوگی، اس طرح بزرگوں کے علوم کے عدم فہم کی شکایت دور ہوگی۔

قرآن کو پیش کرنے کے لئے

سلف صالحین کے قرآنی علوم سے استفادہ کی ضرورت

یہ دعویٰ کہ میں نے قرآن کو لغت، اپنے علم اور اپنی ذہانت سے سمجھکر، اس کی معنیٰ ومفہوم کو پیش کرنے کی کوشش ہے، نیز میرے ذہن اور علم نے مجھ پر جس طرح قرآن کے مفہوم کو آشکار کیا ہے، اسے میں نے تفسیر کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔

میرا یہ دعویٰ صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ قرآن کا مفہوم اور اس کی روح کے فہم کا ایک پورا تسلسل ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام نے صحابہ کرام سے تابعین کرام نے، اس کے بعد پورے تسلسل سے علماء نے اپنے پیشرو علماء سے حاصل کیا ہے۔

قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کی صورت یہی ہے کہ سلف صالحین اور علمائے ربانیین نے قرآن کو جس طرح سمجھا ہے، ان کے فہم قرآن سے بھرپور استفادہ کیا جائے اور تبحر علمی، رسوخ فی الدین، عربی زبان پر پوری طرح دسترس کے ساتھ ساتھ تقویٰ کے بہتر مقام کے حصول کی کوششیں بھی ہوں، اس کے بعد ہی بھرپور علمی وذہنی صلاحیتوں سے قرآن کا جو مفہوم پیش ہوگا، وہ صحیح ہوگا، دوسری صورت میں قرآن کی تشریح کے نام پر نئی تشریح ہوگی، جس میں قرآن کے پیش کردہ نصب العین اور فرائض وواجبات کے نظام میں تغیر وتبدل کا خطرہ در پیش ہوگا اور اس کا حقیقی مفہوم متاثر ہوگا۔

قرآن کی جب بھی سلف صالحین کی پیش کردہ تشریح سے بھرپور استفادہ کے بغیر اپنے علم اور عقل کی مدد سے تشریح ہوئی ہے تو اس سے فائدہ سے زیادہ نقصان ہوا ہے اور امت میں نئے گروہ پیدا ہوئے ہیں اور قرآن کے نام پر جدوجہد کے نئے رخ متعین ہوئے ہیں۔

مجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ میں فہم قرآن کے سلسلے میں سلف صالحین کی مسلمہ حیثیت کو نظر انداز کرکے، قرآن کی نئی علمی تشریح کروں، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو سلف صالحین کا متبادل سمجھتا ہوں۔ یہاں اس کی صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے، غلام احمد پرویز صاحب نے قرآن کو سلف صالحین کی بجائے اپنے ذاتی علم، لغت اور عقل کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں مفہوم القرآن، ابواب القرآن اور لغت قرآن کے نام سے ضخیم جلدوں پر مشتمل کتابیں بھی لکھیں، لیکن اس کا حاصل گمراہی کی صورت میں نکلا۔

چونکہ قرآن کے الفاظ کے بہت سارے معنیٰ ہیں، اس لئے قرآن کے وہی معنیٰ و مفہوم قابل قبول ہوگا، جو سلف صالحین کے تسلسل سے ہم تک پہنچا ہے۔

یقیناً نئے دور میں نئے اسلوب سے قرآن کو پیش کی ضرورت ہے، لیکن یہ ضرورت پیش کرنا ہما شما کے بس کی بات نہیں ہے، اس کے لئے سلف صالحین سے ذہنی وعلمی مطابقت، قرآن میں عرصہ تک ڈوبتے رہنے، تزکیہ و تقویٰ کی صلاحیتوں سے بہرہ وری اور عرصہ تک اہل اللہ کی صحبت ناگزیر ہے، اس کے بغیر قرآن کی اپنے علم وفہم سے جو تشریح ہوگی، اس سے امت میں نئے گروہوں کا اضافہ ہوگا اور امت کا تسلسل متاثر ہوگا اور قرآن کے مفہوم میں بھی تغیر واقع ہوگا۔ اور اس طرح کی قرآنی تشریح سے جدوجہد کا رخ افراد کی ذات اور افراد معاشرہ ہونے کی بجائے خارجی زندگی میں جدوجہد ہوگی، جس سے افراد کی زندگیاں تضادات سے عبارت ہو جائیں گی۔

غلبہ اسلام کی ضرورت اور
اس کی صحیح ترتیب

اسلام کے بارے میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ وہ مکمل نظام زندگی ہے، جو زندگی کے سارے شعبوں کے بارے میں تعلیمات دیتا ہے، اس لئے اسلام کے نفاذ کے لئے جدوجہد ایک اعتبار سے دین کے مقاصد میں نہیں تو فرائض میں ضرور شامل ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ اسلام خلافت کے نظام کے احیاء کا علمبردار ہے، اس کے بغیر اسلام کے سارے تقاضے پورے نہیں ہوتے، اسلام، مسلم امت کو مظلومیت اور بے بسی کی حالت سے اوپر اٹھا کر، دنیا کی بہترین ملت کی حیثیت سے سامنے لانا چاہتا ہے، جو اسلامی تعلیمات اور اسلامی قوانین پر پوری طرح عمل پیرا ہونے سے ممکن ہے۔

مسلمانوں کی حالت میں جب تک بہتری کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی، جب تک وہ اسلام کے غلبہ اور احیائے خلافت کے کام کے لئے جدوجہد نہیں کرتے، اس لئے کہ مسلمانوں کی زندگی میں اسلام کے صحیح ثمرات اسی وقت ظاہر ہوں گے، جب اسلام کی سیاسی، اجتماعی، معیشتی اور معاشرتی شعبوں میں اسلامی تعلیمات کا نفاذ ہوگا اور اس کی برکتوں کا ظہور ہوگا۔

یہ وہ وقت ہوگا، جب دنیا کے سامنے بھی اسلامی نظام اپنی ساری خیر و برکتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا اور انہیں اپنی اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں درپیش بحران سے بچاؤ کی صورت اسلام کے عدل اجتماعی میں ہی نظر آئے گی، اس طرح کی اسلامی ریاست سے مسلمان ہی نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے لئے اسلام نجات دہندہ کی حیثیت سے سامنے آئے گا۔

لیکن اس طرح کی اسلامی ریاست کے لئے سب سے پہلا کام جو کرنا ہوگا، وہ غلبہ دین کا کام کرنے والے افراد کی اصلاح و تزکیہ کا کام ہے، نفس کی اصلاح اور اس کی پاکیزگی کے کام کے بغیر غلبہ دین اور احیائے دین کے کام میں پیش قدمی کی صورت کا پیدا ہونا ممکن نہیں، اس لئے کہ جو افراد اپنی

انفرادی حیثیت میں پاکیزہ سیرت و کردار کے حامل نہیں، اخلاق حسنہ، محبت، نرمی، رواداری، ایثار وقربانی، دوسروں کی عزت وتکریم، امانت ودیانت، صبر وشکر اور افراد کی کوتاہیاں معاف کرنے جیسی صفات سے بہرہ ور نہیں، وہ غلبہ دین کی صورت میں اسلام کے پاکیزہ نظام کی صحیح ترجمانی ونمائندگی کر سکیں، اور اسلام کی مثالی تعلیمات کا نمونہ بن سکیں، ممکن ہی نہیں، اس لئے غلبہ اسلام کے لئے اولین کام جو کرنے کا ہے، وہ اسلام کے لئے کام والے افراد کا نفسی قوتوں سے مقابلہ کر کے، نفس کو مہذب بنانا ہے۔

دوسرا کام جو کرنے کا ہے، وہ معاشرہ کی اصلاح کا کام ہے، جب تک افراد معاشرہ کا قابل ذکر حصہ رضاکارانہ طور پر اسلام کی پابندیاں قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو، اس وقت تک حکومتی سطح پر نفاذ اسلام کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔

نفسی قوتوں کے بارے میں

نصابی کتب کے ذریعہ فہم پیدا کرنے کی ضرورت

نفسی قوتوں نے ریاست اور معاشرہ میں جو ہمہ گیر اور ہمہ جہتی فساد برپا کیا ہے، اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ ان قوتوں کے فہم کے بارے میں شعور وادراک پیدا کیا جائے اور اس کام کو فیصلہ کن اہمیت دی جائے، ہمارے دردمند افراد مسلسل اس بات کا رونا روتے ہیں کہ کرپٹ اہل سیاست اور بیوروکریسی نے ملک کو لوٹ مار کے ذریعہ معاشی طور پر مفلوج کر دیا ہے اور اس کا جو علاج تجویز کیا جارہا ہے، وہ قانون کو متحرک کرنے کا علاج ہے، لیکن قانون سے نفسی قوتیں اور حب مال کے جذبات قابو میں نہیں آسکتے، اس کے لئے ضروری ہے کہ نفسی قوتوں کی سنگینی، ان کی مکروفریب کی واردات، نفس کا طریقہ واردات اور معرفت نفس کے موضوع پر نصابی کتب میں تعلیم کا اہتمام کیا جائے، تاکہ نظام تعلیم افراد میں کسی نہ کسی حد تک کم از کم نظریاتی طور پر خود شناسی اور اللہ شناسی کا شعور پیدا کرنے کا ذریعہ ہو۔

اسے اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام بھی کہا جاتا ہے، اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام میں دل، نفس، روح اور عقل کی جداگانہ صلاحیتوں، ان کے باہمی تعلق اور ان کی خصوصیات سے بحث کی جاتی ہے۔

اسلام کا یہ اخلاقی اور روحانی نظام اگرچہ عملی نوعیت کا ہے، لیکن کم از کم اس کے خطوط ذہنی اور نظریاتی طور پر تو واضح ہوں، تاکہ فرد وافراد نفس پرستی کی قوتوں کی نوعیت کو کسی نہ کسی حد تک سمجھ سکیں، اس سے بچاؤ کی صورت تو اس کے بعد ہی پیدا ہو سکے گی۔

مسلم نفسیات کے ماہروں کا کہنا ہے کہ جب تک دل کی قوتیں نفس کی قوتوں پر غالب نہ ہوں گی تب تک فرد وافراد نفس پرستی کی قوتوں کے زیر اثر زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کے جنون،

خود پرستی، مفاد پرستی، انانیت، حرص وہوس، حسد وجلن، اپنی برتری، دوسروں کی تحقیر اور دنیا کے زیب وزینت کے سامان کے جذبات سے مغلوب رہیں گے۔ اور ان بیماریوں سے بچاؤ کی ساری تدابیر ناکامی سے دوچار ہوں گی، اس لئے ضروری ہے کہ معرفت نفس اور معرفت رب کے علم کو نصاب تعلیم کا حصہ بنایا جائے۔ بھٹ شاہ (سندھ میں) اس سلسلہ میں صوفی یونیورسٹی قائم ہوئی ہے، جو اس سلسلہ میں بہتر اور مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے، لیکن صوفی یونیورسٹی کے قیام کے پس منظر میں جو ذہنیت کارفرما ہے، وہ یہ ہے کہ تصوف وروحانیت کا ایسا پہلو اجاگر کیا جائے، جس میں اسلامی شریعت اور حمیت دین کا پہلو کمزور ہو اور سارے مذاہب کے میلاپ سے تصوف کا ایک ملغوبہ تیار کیا جائے۔

اس طرح کا تصوف اسلام کے اخلاقی وروحانی نظام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، اس سے معرفت نفس اور معرفت رب کی صورت کا پیدا ہونا بھی ممکن نہیں، اس لئے کہ مشرکانہ مذاہب میں سرے سے ایمانی عقائد ہی صحیح نہیں تو معرفت رب کا ادراک کیسے ہوگا۔

خودرائی کی بیماری

اور اس کے نتائج

اس دور میں خودرائی کی بیماری عام ہوئی ہے، خاص طور پر دینی اور روحانی معاملات میں خود رائی (یعنی اپنی رائے کو حرف آخر سمجھنا) سخت نقصاندہ ہے، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ذہین افراد کی خودرائی کے پس پشت نفس کی قوت کارفرما ہوتی ہے، جو فرد وافراد کو دعویٰ کی راہ پر گامزن کرنے کا باعث بنتی ہے۔

دنیاوی مسائل ومعاملات میں بھی اپنے اپنے شعبہ کے ماہر افراد کی رہنمائی ضروری ہوتی ہے، اس کے بغیر فرد کے لئے مسائل کی گہرائی کو سمجھکر صحیح لائین اختیار کرنا دشوار ہوتا ہے۔

عام فرد کی خودرائی کا اثر اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے، جب کہ علمی مزاج اور ذہنی صلاحیتوں کے حامل فرد کی خودرائی کا اثر معاشرہ پر گہرا پڑتا ہے، سیاسی دائرہ ہو یا مذہبی، اس میں موجود انتشار وخلفشار کے پس پردہ مفادات کے ساتھ خودرائی کو بھی بڑا عمل دخل حاصل ہے۔

خودرائی کا علاج عاجزی وانکساری کی روش ہے، جو بزرگوں کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے، لیکن چونکہ نفس اپنی بڑائی چاہتا ہے، اس لئے وہ بزرگوں کی بزرگی اور سرپرستی کو قبول کرکے، عاجزانہ روش اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں، خودرائی کتنے ہی اخلاص کا ساتھ ہو، ذہین علمی ومتحرک شخصیت کے لئے خودرائی اپنے لئے جداگانہ راہ اختیار کرکے، دوسروں کو اپنی اختیار کردہ راہ پر لگانے کا ذریعہ بنتی ہے اس طرح معاشرے میں ذہین ومتحرک افراد کی خودرائی گروہ بندی کا موجب بن جاتی ہے۔

جب تک فرد چھوٹے پن کے مراحل سے گزر کر، علمی اور روحانی طور پر بہتر مقام پر نہیں آتا اور فرد میں عاجزی، انکساری اور اپنے سے بڑوں سے استفادہ کرنے کی پوری طرح صلاحیت پیدا نہیں

ہوتی، تب تک خودرائی ذہین افراد کو معاشرہ کو افتراق اور تقسیم سے بچا سکے، مشکل ہے۔ جس طرح عرض کیا گیا کہ خودرائی کے پیچھے بڑاپن اور نفس کی قوت موجود ہوتی ہے۔

جہاں تک اپنی رائے کو رائے کی حیثیت سے پیش کرنے کا تعلق ہے تو وہ بہتر چیز ہے اور افادیت کی حامل ہے، لیکن اپنی تحقیق اور اپنی رائے کو حرف آخر کی حیثیت سے سامنے لانا اور اس پر اصرار کرنا یہ سخت نقصاندہ ہے، اس لئے بزرگوں کے ہاں فرد کو خودرائی کے مضر اثرات سے بچانے کے لئے مجاہدوں کے مراحل سے گزارا جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے لئے اپنی رائے سے دستبردار ہونے کی تاکید کی جاتی ہے، تاکہ خودرائے کے پس پردہ کارفرما انانیت اور ذہنی و علمی برتری کا جذبہ پامال ہو سکے۔

نفس پرستی کی قوتوں کے ماہروں کا بیان کردہ یہ نکتہ بجا ہے کہ نفس کی قوتوں کے مشاہدے کے بغیر خودرائی کی بیماری ذہین و متحرک علمی شخصیتوں کو معاشرہ کو جتنا بھی نقصان پہنچانے کا موجب بنے، کم ہے۔

عبرت و موعظت کی صلاحیت کا سلب ہونا، عتاب کی علامت ہے

قرآن نے ماضی کی قوموں کی سرکشی اور انکار کی روش اور اس کے نتیجہ میں ان کو ملنے والی سزا اور عذاب کا بار بار ذکر کیا ہے، ان کا بار بار ذکر دراصل ہمارے انتباہ کے لئے ہے کہ ہم ان قوموں کی طرح سرکشی کی روش سے باز آجائیں۔

ماضی کی قوموں کی سرکشی اور اطاعت کی راہ پر نہ آنے کا سبب دراصل نفس پرستی کی قوتوں کے غلبے ہی کا نتیجہ تھا، اس میں تکبر، حسد اور برتری کی نفسیات وغیرہ شامل تھیں، اس میں علم کی کمی کو زیادہ عمل دخل نہیں تھا، بلکہ خواہشات کے غلبے کی عادت نے ان کی عبرت و موعظت کی صلاحیت سلب کرلی تھی، قرآن میں فرعون اور فرعونیوں کے بارے میں آتا ہے کہ ان کے دلوں نے یقین کر لیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو تعلیمات لائے ہیں وہ برحق ہے، لیکن انہوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے انکار کیا۔

جب حق و صداقت کا پیغام خواہشات نفس سے ٹکراتا ہے تو عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ فرد و افراد نفس کی خاطر حق سے انکار کی روش کو اختیار کرتے ہیں، یہ ایسی روش ہے جس کا اکثر قوموں کی طرف سے مظاہرہ ہوتا رہا ہے۔

اللہ نے انسانی فطرت میں اپنی عبادت اور اطاعت کے داعیے (تقاضے) کو رکھدیا ہے، اگر فطرت کے اس تقاضے کو صحیح خطوط پر پروان چڑھنے کا موقعہ ملتا رہے تو فرد عبادت، اطاعت، ذکر و فکر، اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کے ارتقا کے مراحل طے کر سکتا ہے، لیکن انسان کی آزمائش کی خاطر اس میں نفس کی جو قوت رکھی گئی ہے، وہ فرد کو مادیت پرستی کی راہ پر گامزن کر کے، فطرت اور فطری

تقاضوں سے دور کرنے کا موجب بنتی ہے، اس طرح عبادت واطاعت کی راہ مشکل سے مشکل تر ہوتی جاتی ہے اور فرد نفس پرستی کی قوتوں کی زنجیر میں قابو ہو جاتا ہے۔

اس وقت انسانیت کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ وہ عالمی سطح سے لے کر محلہ کی سطح تک عام طور پر نفس پرستی کی قوتوں کے زیر اثر مادیت پرستی کی سرکش موجوں کی نذر ہے، فرد دنیا پرستی، مفادات، خود غرضی اور نفسا نفسی کی فضا سے اوپر اٹھکر، مخلصانہ عبادت واطاعت اور ذکر وفکر کی طرف آنے کے لئے تیار ہی نہیں۔

انسانیت کی یہ عمومی روش ایسی ہے، جس سے ایک طرف تو دنیا انسانیت کی پامالی اور جرائم سے بھر گئی ہے، دوسری طرف یہ روش اللہ کے عتاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

ضرورت ہے کہ افراد معاشرہ کو جھنجھوڑا جائے اور انہیں خواہشات نفس کی راہ اختیار کرنے کے نتائج سے آگاہ کیا جائے اور اللہ کی مخلصانہ عبادت واطاعت کی راہ کی دعوت دی جائے۔

ایک فاضل شخصیت کی طرف سے

مربی اساتذہ سے صحبت ورابطہ کی تلقین

ملک کے ایک بڑے مدرسہ کی فاضل شخصیت نے اپنے مدرسہ کے طلبہ کو سند کی تقریب سے خطاب کرتے وقت ایک اہم نصیحت فرمائی ہیں، وہ نصیحت یہ ہے کہ مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے مربی اساتذہ سے تعلق ورابطہ کو قائم رکھیں، دوسری صورت میں دینداری اور علم کے نام پر دنیاداری کی راہ پر گامزن ہونے اور وقت کے فتنوں سے بچنا مشکل ہے نیز دنیاداری کی یہ لائین اس طرح آئے گی کہ فرد کو اطلاع بھی نہ ہو گا کہ وہ دنیا کی دلدل میں پھنستا جائے گا اور ساتھ ساتھ علم اسے اس کے لئے دلائل بھی فراہم کرتا رہے گا۔

مذکورہ فاضل شخصیت کی طرف سے طلبہ کو یہ نصیحت ہر سال سند فضیلت کی تقریب کے موقعہ پر کی جاتی ہے۔

فاضل شخصیت کا بیان کردہ یہ نکتہ انتہائی اہم ہے، سوال یہ ہے کہ مربی اساتذہ سے تعلق کے بغیر علم اور ظاہری دینداری فرد کو دنیاداری یا جدیدیت سے تاثیر پذیری کی راہ پر گامزن کرنے کا باعث کیوں بنتی ہے؟ دراصل نفس ایک شوریدہ اور خوفناک قوت ہے، نفسی قوتوں کی لہریں ہر وقت اندر سے اٹھتی رہتی ہیں اور مادہ پرستی کا ماحول نفسی قوتوں کو مزید ابھارنے کا کردار ادا کرتا ہے، اگر اپنے مربی اساتذہ سے تعلق قائم ہے تو ان کے دل سے للھیت اور اخلاص کے اجزاء نکل کر دل میں داخل ہو کر، نفسی قوتوں کی روک تھام کا کردار ادا کرتی ہیں اور فرد کے شعور کو بھی نفسی قوتوں کی یرغمالی سے بچاتی رہتی ہیں۔ یہ تعلق منقطع ہونے کے بعد فاسد ماحول کے غلبہ کی وجہ سے نفسی قوتوں کو دل اور ذہن کو یرغمال بنا کر، بہتر سے بہتر علم کلام اور دلائل کے ذریعہ سے مادیت، جدیدیت اور دنیاداری کی راہ پر لگایا جاتا ہے۔

نفس کو مربی اساتذہ کی صحبت کے انوار اور ذکر وفکر کے مجاہدے ہی اسلام کے صحیح خطوط پر گامزن رکھ سکتے ہیں، علم اور استدلال اس سلسلے میں بہت زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتا، البتہ جب

صحبت کے انوار اور مجاہدوں سے نفس ایک حد تک مہذب ہو جاتا ہے، اس کا قابل ذکر حد تک تزکیہ ہو جاتا ہے تو اس وقت علم غیر معمولی طور پر مفید اور بابرکت ثابت ہوتا ہے۔

اس دور میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ جن باصلاحیت فارغ علماء نے بھی مذکورہ فاضل شخصیت کی اس نصیحت کی خلاف ورزی کی، وہ جدیدیت اور دنیاداری کی تیز لہروں کی نذر ہو گئے اور ان کا علم اور ظاہری دینداری انہیں اس سے روکنے میں ناکام ثابت ہوئی۔

اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس دور میں دنیا بہت خوبصورتی سے سامنے آئی ہے۔ دنیا کے حصول کی جدوجہد میں علم کو استعمال کرنا آسان ہے نیز ذہین افراد میں علم اور اجتہاد کے نام پر وقت کے فتنوں سے متاثر ہونے کی روش عام ہوئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نفس لوامہ کو طاقتور بنانا انتہائی ناگزیر ہے، نفس کی یہی حالت نفس امارہ کا مقابلہ کر سکتی ہے، دوسری صورت میں فرد ہر وقت خطرہ سے دوچار ہونے لگتا ہے۔

اس نکتہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اپنے مربی استاد کی صحبت اور ان سے رابطے سے فرار اور ذکر وفکر کی کم سے کم خوراک سے محرومی نفس کا بڑا فریب ہے، ایسے افراد پر نفسی قوتیں آسانی سے یلغار کر کے، انہیں اپنا شکار بنا لیتی ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

معاشرتی برائیاں اور اُن کا حل

معاشرتی برائیاں نام ہے عقل وارادہ کی کمی کا، جب انسان میں عقل وارادہ کمزور پڑ جاتا ہے تو وہ برائی کی طرف مائل ہوتا ہے جس سے معاشرہ تباہ ہوتا ہے اور انسانی افراد واجتماع کو روحانی اور مادی نقصان پہنچتا ہے، بلکہ یہ برائیاں جب کسی قوم میں عام ہو جاتی ہیں تو قوم وملک کی ہلاکت وبربادی کا سبب بنتی ہیں۔

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اس لیے قرآن نے جابجا معاشرتی برائیوں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی اس کا علاج بھی تجویز کیا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربی وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون۔" (سورہ نحل: ۹۰) (اللہ انصاف اور احسان سے کام کرنے اور رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے وہ بے حیائی، ناپسندہ بات اور سرکشی سے روکتا ہے، تمہیں وہ نصیحت کرتا ہے شاید کہ تم نصیحت پاجاؤ)۔

اس آیت کریمہ میں معاشرتی برائیوں کو تین بڑے عنوانوں میں تقسیم کیا گیا جو یہ ہیں:

۱: فحشاء یعنی بے حیائی کے کام، ۲۔ منکرات جس سے پوری جماعت کی زندگی متاثر ہو، ۳۔ اور بغی یعنی سرکشی، جیسے چوری، قتل، ڈاکہ اور ملک وقوم سے غداری کے کام۔

یہ وہ اخلاقی برائیاں ہیں جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکساں طور پر برا کہا ہے، وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہیں اور دین وشرافت کی نگاہ میں وہ سب برائیاں گناہ اور ناپسندیدہ باتیں ہیں، اگر ان کو جائز قرار دیدیا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے امان اٹھ جائے اور کسی کی جان ومال اور عزت وآبرو سلامت نہ رہے۔

قرآن مجید نے اس ضمن میں اخلاق کا معتدل نظام پیش کیا، وہ اخلاق جو خدا کو پسند ہیں فضائل کہلاتے ہیں اور جن کو خدا ناپسند کرتا ہے ان کو رذائل کہتے ہیں، قرآن مجید نے جن فضائل اخلاق کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:

تقویٰ

''تقویٰ یعنی عفت وپاکیزگی، عدل وانصاف، عفوودرگزر، تواضع وانکساری اعتدال ومیانہ روی، حق گوئی، احسان اور صلہ رحمی۔''

ان فضائل کے نہ ہونے سے جو معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔

حرص وطمع، بے حیائی، فضول خرچی، جھوٹ، رشوت، قماربازی، ناپ تول میں کمی، بدی، غیبت، یہ وہ معاشرتی برائیاں ہیں جن کو قرآن نے ان معاشرتی برائیوں کو فحشاء اور منکرات سے تعبیر کیا ہے، قرآن مجید نے ان معاشرتی برائیوں کا جو علاج تجویز کیا ہے وہ یہ ہے کہ:

''ان الصلاۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر۔'' (بے شک نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بڑی چیز ہے)۔

شرم وحیا

بے حیائی کا علاج شرم وحیا ہے، بے حیائی کی باتوں سے بچنا لیکن امر حق کے اظہار میں شرم وحیا دامن گیر نہ ہونا، یعنی معاشرتی برائیوں کا قرآن علاج ہے، حیا نام ہے فواحش ومنکرات سے بچنے کا، جذبۂ حیا جو انسانوں کو معاشرتی برائیوں سے روکتا ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر انسان بے حیا ہو کر جو چاہے کر سکتا ہے، حیا سے بھلائی پھیلتی ہے، نماز، حیا کا سرچشمہ ہے اور وہی برائیوں سے بچاتی ہے۔

عدل وانصاف

اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں عدل وانصاف سے کام لینے کی بھی ضرورت ہے، جب عقل کی قوت اور نیکی کا چراغ، جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہو تو اس وقت عدل وانصاف کا سہارا لینا پڑتا ہے، بعض برائیاں وہ ہیں جن کے کرنے سے خدا کی رحمت چھن جاتی ہے پھر وہ برائیاں ہیں جو خدا کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں، پھر وہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں، مثلاً شرک، ایک ایسی معاشرتی

خرابی ہے کہ جس کا مرتکب رضائے الٰہی کو نہیں پا سکتا، بلکہ اللہ شرک کو معاف نہیں کرتا، شرک کرنے والا خدا کی رحمت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوتا ہے، اس لیے اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کے معبدوں سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال پھینکا، باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش یک قلم موقوف کر دی، اور ایک خدا کی عبادت کا اعلان کیا۔

درگذر

قرآن مجید نے دوسرا علاج جو معاشرتی برائیوں کو دور کرنے کے لیے تجویز کیا ہے وہ یہ ہے:

''ولاتستوی الحسنة ولا السیئة ادفع بالتی ھی احسن فاذ الذی بینک وبینه عداوة کانه ولی حمیم۔'' (سورہ حم سجد:۳۴) یعنی برائی اور بھلائی برابر نہیں، اگر کوئی برائی کرے تو اس کا جواب اچھائی سے دو، کیونکہ جاہلوں سے درگزر کرنا اور احسان کرنا نیکی ہے، اللہ احسان کے بدلے کو ضائع نہیں کرتا، ہر نیکی ثواب کا کام ہے، احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ سے برائیاں دور ہوتی ہیں، اور نیکی کے عمل سے، معاشرتی برائیوں کا خاتمہ ہوتا ہے، اس لیے عفوودرگزر سے کام لینا چاہئے، نیکی بدی کو دھو دیتی ہے، بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کو محیط ہے، بھلائی کرنا بہت سی برائیوں کا علاج ہے، برائی کی جگہ، بھلائی کرنا۔ معاشرتی خرابیوں کا سب سے بڑا علاج ہے، اسی لیے قرآن مجید نے کہا ہے:

''ان الحسنات یذھبن السیئات'' (سورہ ہود:۱۴) (بے شک نیکیاں برائی کو دور کر دیتی ہیں)۔

نیکیوں کو اختیار کرنے اور زندگی کو اچھے اعمال سے مزین کرنے کی مثال قرآن مجید نے رحمٰن کے بندوں کے عنوان سے اس طرح دی ہے:

''وعباد الرحمٰن الذین یمشون علیٰ الارض ھوناً واذا خاطبھم الجاھلون قالو سلاماً والذین یبیتون لربھم سجدا وقیاماً والذین یقولون ربنا اصرف عنا عذاب جھنم ان عذابھا کان غراماً انھا ساءت مستقرا ومقاماً والذین اذا انفقو لم یسرفو ا ولم یقتروا وکان بین ذٰلک قوماً والذین لا یدعون مع اللہ الھاً آخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولایزنون ومن یفعل ذالک یلق اثاماً۔ (سورۃ الفرقان:۶۳۔۶۸) (اور خدا کے

بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کر کے اور (عجز وادب سے) کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں اور وہ جو دعا مانگتے ہیں کہ اے پروردگار دوزخ کے عذاب کو ہم سے دور رکھیو کہ اس کا عذاب بڑی تکلیف کی چیز ہے اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بُری جگہ ہے اور وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اُڑاتے ہیں اور نہ وہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ اعتدال کے ساتھ، ضرورت سے زیادہ نہ کم اور وہ جو خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جاندار کا مارڈالنا خدا نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے مگر جائز طریقہ پر (یعنی حکم شریعت کے مطابق) اور بدکاری نہیں کرتے اور جو یہ کام کرے گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا)۔

اس کے علاوہ معاشرتی خرابیاں جن چیزوں سے دور ہو سکتی ہیں قرآن مجید نے ان کی تفصیل بتائی ہے اور وہ یہ ہیں:

۱۔ تقویٰ، ۲۔ اخلاص، ۳۔ توکل، ۴۔ صبر وشکر تقویٰ نام ہے دل کی پاکیزگی اور عمل صالح کا، اخلاص نام ہے دیانت داری کا، توکل خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں، اور صبر تمام شیطانی طاقتوں پر قابو پانے کو کہتے ہیں تقویٰ سے عظمتِ نفس پیدا ہوتی ہے، اور انسان کا ضمیر بیدا ہوتا ہے اسی لیے اسلام میں برتری کا معیار تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے، اخلاص خدا کی خوشنودی اور بجاآوری کو کہتے ہیں، ظاہر ہے اگر انسان میں پرہیزگاری اور زندگی سے خلوص پیدا ہو جائے تو پورا سماج معاشرتی برائیوں سے پاک ہو سکتا ہے کیونکہ جس میں اللہ کا خوف ہوگا وہ نہ بددیانتی کرے گا اور نہ کسی کی حق تلفی کرے گا، نہ اس کے قول و عمل میں تضاد ہوگا اور نہ وہ اپنے فرائض منصبی سے پہلو تہی کرے گا، اسی طرح توکل اور صبر، کامیابی کی اصل بنیاد ہیں، مشکلات اور مصیبتوں کو برداشت کرنا۔ مصائب کا پامردی سے مقابلہ کرنا اور ضبط نفس سے کام لینا، کسی قوم اور ملک کی ترقی کا زینہ ہیں۔

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت

امتِ اسلامیہ آج جس نازک دور سے گذر رہی ہے وہ اس امت کی تاریخ میں بہت اہم اور تشویشناک مرحلہ ہے، مسلمان جہاں بھی پائے جاتے ہیں خواہ وہ عالم اسلام ہو یا غیر اسلامی ممالک، ہر جگہ وہ من حیث القوم کمزور، پس ماندہ، مظلوم اور زخم خوردہ ہیں، ان کی حالت اس شکست خوردہ کی سی ہے جو میدانِ جنگ سے پسپا ہو کر لوٹے اور ہمیشہ کے لیے اس پر ذلت و کمتری کا احساس مسلط ہو جائے، جس ملک کو آپ چاہیں دیکھ لیں اور جس علاقہ پر چاہیں نظر دوڑا لیں، سب سے زیادہ کمزور اور مغلوب صرف مسلمانوں کا طبقہ ملے گا، شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک جہاں چاہئے، مسلمانوں کی مغلوبیت، ان کی مظلومیت، ان کے احساس کہتری کی داستانِ تازہ سن اور پڑھ لیجیے۔

اگرچہ بعض مسلم ممالک ایسے بھی ہیں جہاں مسلمان بظاہر خوشحال، غالب اور طاقتور ہیں، لیکن اندرونی طور پر وہ بھی ذہنی غلامی، احساس کمتری میں مبتلا ہیں، وہ باطنی حیثیت سے بالکل شکست خوردہ اور مرعوب ہیں، ان پر دوسری ترقی یافتہ قوموں کے افکار و نظریات کا ایسا غلبہ ہے کہ وہ زبان حال سے اسلام کو ایک بوسیدہ مذہب، ایک رجعت پسندانہ نظریہ، اور ایک کرم خوردہ نظام تصور کرتے ہیں۔

یہ وہ صورتحال ہے جو مسلمانوں کے لیے نہ صرف تشویشناک بلکہ ملت کے شیرازہ کو بالکل منتشر اور امت کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دینے کے لیے کافی ہے، اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اگرچہ بہت سے غمگسارانِ ملت اور ہمدردانِ امت اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کام کر رہے ہیں اور تمام اسلامی اور دینی جماعتیں ان ناخوشگوار حالات کو محسوس کر رہی ہیں اور ان کو بدلنے کے لیے جدوجہد میں مصروف ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس امت کی تاریخ کا وہ نازک ترین مرحلہ ہے جس سے گذرنے کے لیے ہماری یہ تمام کوششیں اس وقت بارآور ہو سکتی ہیں جب ہم کمتری، مغلوبیت اور

مظلومیت کا احساس ختم کر کے اپنے آپ کو اس منصب امامت و قیادت کا اہل بنالیں جو ہمارے اور صرف ہمارے لیے مخصوص ہے اور جب ہم صحیح معنوں میں جانشین خاتم الانبیاء بن کر خلافت ارضی کی ذمہ داری سنبھالیں جو صرف ہمارا حصہ ہے۔

لیکن آج اس ترقی یافتہ دنیا میں ہم نے اپنا مقام سب سے پیچھے رکھا ہے، ہم مادہ پرست قوموں کے غلام بن کر زندگی گذارنے میں فخر محسوس کرنے لگے ہیں، ہم اس خالص مادہ پرست تہذیب کی تقلید اور خوش چینی کو ترقی اور تمدن کی علامت سمجھنے لگے ہیں، ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے ان قوموں کی اتباع و تقلید وقت کا ایک اہم ترین فریضہ ہے اور مصلحت کا تقاضہ ہے۔

تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جو اپنے مذہب کی غیرت اور اس کا احترام اپنے دل میں رکھتے ہوئے موجودہ دور میں اسلامی نظام حیات کو ناکافی اور اس کی تمام تعلیمات کو ناقابل عمل تصور کرتا ہے، ان کا خیال ہے کہ اسلامی نظام کو برپا کرنے کے لیے ہمیں بہت پیچھے لوٹنا چاہیے، اور اس معاشرہ کو بروئے کار لانا چاہئے جو اس نظام کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور جو واقعی اور عملی زندگی میں اس سے مستفید ہونے کے جذبات سے معمور ہو، ان کے نزدیک موجودہ تہذیب اور عصر حاضر کی ثقافت وعلوم کا سیلاب بلاخیز اپنے گرداب سے نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا، وہ کہتے ہیں کہ اس گریز پا ترقی کے دور میں صرف اتنا کر لینا کافی ہے، کہ نظریاتی طور پر آپ مذہب کو مانیں اور اس کی قابل عمل تعلیمات پر عمل کر لیں، ان کے نزدیک ایسے زمانہ میں نماز وروزہ اور دیگر فرائض کا پورا کر لینا ہی بہت بڑا دینی کام ہے، بلکہ عصر حاضر کا سب سے بڑا جہاد ہے۔

یہی وہ شکست خوردہ ذہنیت ہے جو مغرب کی تہذیب، اس کی ترقیوں اور اس کی مادی پیش قدمیوں سے مرعوب ہے، جو کسی حال میں اس کے بالمقابل آنے کی روادار نہیں، وہ مغرب کو ترقی کے اس نقطۂ عروج پر تصور کرتی ہے جس کے بعد کوئی منزل نہیں، اور جو صرف قیادت کی منزل ہو سکتی ہے جس کے سامنے ساری مذہبی، اخلاقی اور انسانی قدریں بازیچۂ اطفال بن کر رہ جاتی ہیں۔

دوسرا طبقہ جو تمام اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں میں جہاں بھی مسلمان موجود ہیں وہ ہے، جس نے حالات کے سامنے سپر ڈال دی ہے، اور اس کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں مادیت، الحاد، اور تمام شیطانی طاقتیں اس قدر طاقتور ہو چکی ہیں کہ ان کے سامنے مذہب ایک ضعیف اور مغلوب الحال نظریہ بن کر رہ گیا ہے، اور جس کے لئے مسجد کے گوشوں، یا اذان کے مناروں یا خطبۂ جمعہ کے منبروں یا بعض مذہبی رسمی تقریبات سے آگے نکلنے کی اجازت نہیں ہے، وہ مذہب کو زندگی کے لیے لازم، اس کی تعلیمات کو انسانیت کا نجات دہندہ، اور اس کی برتری وافضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے حالات کے سامنے اپنے آپ کو مجبور تصور کرتا ہے، اور اپنی ذاتی زندگی تک اسلام کے محدود رکھنے کو بہت کافی سمجھتا ہے۔

لیکن اس بگڑی ہوئی دنیا اور ترقی کے آخری نقطہ تک پہنچی ہوئی اس تہذیب کے دھاروں میں ایک طبقہ وہ بھی موجود ہے جو ہر حال میں اسلامی نظام کو قابل عمل اور اسی کو انسانیت کے سارے دکھ درد کا علاج تصور کرتا ہے، وہ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ان تمام تدبیروں اور وسائل کو بروئے کار لاتا ہے جس کی اسلام اجازت دیتا ہے اور اس کے لیے ہمت افزائی کرتا ہے۔

یہ ان داعیوں اور داعیانہ جذبہ رکھنے والے ان افراد کا طبقہ ہے جو اسلام کی صحیح فہم اور اس کے صحیح منشا و مراد سے واقف ہے، وہ یقین رکھتا ہے کہ دنیا کا سارا بگاڑ، ساری خرابیاں اور ہر طرح کی برائیوں، اور فسادات کا سرچشمہ مذہب سے بے تعلقی ہے اور اس خدا بیزار تہذیب کا نتیجہ ہے جو آج ساری دنیا پر مسلط ہے۔

یہی وہ طبقہ ہے جو مادہ پرست حکومتوں، اور ان کے پیچھے چلنے والی تمام حکومتوں کی نظر میں انتہائی مبغوض اور گردن زدنی ہیں، یہ پر جوش اور ایمان و عمل کے جذبہ سے لبریز وہ افراد ہیں جو اسلام کی حقانیت، اس کی ابدیت، اس کی ہمہ گیریت اور اس کے بلند تصورات پر پختہ ایمان رکھتے ہیں، جو منکر کو دیکھ کر خوش نہیں رہ سکتے، جو گناہوں کو فروغ پاتے ہوئے دیکھ کر تغافل نہیں برت سکتے، جن کی آخری تمنا اسلام کی سربلندی ہے، جو ایمان کی زندگی اور خدا اور سول کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے

والے حلقہ کو وسیع کر کے زندگی میں اللہ کے قانون کو نافذ ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ ہر مرض کا علاج اسلام اور صرف اسلام کو سمجھتے ہیں۔

اس طبقہ کا وجود آج کی ہر حکومت اور ہر اقتدار کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کو کچلنے اور آوازۂ حق کو خاموش کر دینے کے لیے تمام حکومتیں متحد ہیں خواہ وہ مسلم ممالک کی حکومتیں ہوں یا غیر اسلامی ملکوں کی حکومتیں، حد تو یہ ہے کہ اس طبقہ کو پسپا کرنے کے لیے ان حکومتوں نے صرف آتش وآہن کی مدد پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے رعایا کے تمام مسلمان افراد کو ان کی مخالفت کرنے اور ان کا خاتمہ کرنے پر آمادہ کیا۔

گویا اسلام کو مسلمانوں ہی کے ہاتھوں کمزور کرنے اور اس کے تناور درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے انہیں کے افراد کو استعمال کیا گیا اور دین کی مخالفت نام نہاد دین سے، اسلام کی مخالفت مصنوعی اسلام سے، اور اسلامی قدروں کی مخالفت مصنوعی مذہبی قدروں سے کی جانے لگی، ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کو، ایک جماعت دوسری جماعت کو، ایک شخص دوسرے بزرگ کو نقصان پہونچانے کے لیے اس طرح آمادہ ہو گیا کہ گویا وہ کوئی بہت مقدس اور کوئی بہت عظیم اسلامی مہم، انجام دے رہا ہے، جس سے غفلت برتنے پر آخرت میں اس کو جوابدہ ہونا ہوگا۔

یہ ہے وہ تلخ حقیقت، جو آج مسلمانوں کے معاشرہ میں ہر جگہ موجود اور محسوس ہے، کہیں بڑے پیانے پر، کہیں حکومتوں کی سرپرستی میں اور کہیں جماعتوں کی سرپرستی میں، کہیں ذاتی بغض وعناد کے جذبات کام کر رہے ہیں تو کہیں جاہ ومنصب کی حرص وہوس اپنی کمندیں پھیلا رہی ہے۔

اس افسوس ناک حقیقت سے بھی انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ اسلام دشمن طاقتوں اور اس کے مخالفین کو اس طرز عمل سے بہت شہ ملی، انہوں نے خواہ اس موقع کو غنیمت سمجھا ہو، یا کوشش کر کے یہ موقع پیدا کیا ہو، جو صورتحال بھی ہو، بہر حال وہ مسلمانوں کو کمزور اور مغلوب، ذلیل وخوار، کمزور وناتواں اور شکست خوردہ بنانے کے لئے بہت کافی تھی، چنانچہ اس کا رد عمل یہ ہوا اور برابر ہوتا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی یہ عظیم اور غالب امت صرف کمزور اور مغلوب ہی نہیں ہے، بلکہ احساس ذلت ورسوائی کے ایسے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی ہے جس نے اس کو ہر بلندی اور پیش قدمی سے

محروم کر رکھا ہے، اور جس سے بظاہر (جب تک یہ صورتحال اور طرز عمل قائم رہے) نجات کی کوئی توقع بھی نہیں۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

میں نہیں سمجھتا کہ امت اسلامیہ کی موجودہ مغلوبیت ومظلومیت کسی اور طرز عمل کا نتیجہ ہے، بلکہ اسی طرز عمل نے اس کو اس انجام تک پہونچا دیا کہ دس کروڑ مسلمانوں کی ۲۲ بڑی بڑی حکومتوں نے مل کر بھی تنہا ایک معمولی تعداد رکھنے والی ذلیل قوم یہود کو جو ان کے ملک میں دخیل اور جارح قوم تھی جو ہر چہار جانب سے انہیں حکومتوں سے گھری ہوئی تھی، صرف اس کو بھی یہ ساری حکومتیں ایک آواز اور ایک جسم ہو کر زیر نہ کر سکیں، بلکہ شکست کھا کر اور جان ومال حتی کہ مسجد اقصیٰ جیسی مقدس یادگاروں تک کا عظیم تر خسارہ برداشت کر کے واپس آگئیں۔

اسی طرز عمل کا انجام ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی تعلیمات وشعائر، اور اس کی روح سے بالکل کٹ چکا ہے، اور اس نے وہ کردار ادا کرنا شروع کر دیا ہے جو وقت کی سب سے ذلیل وکمزور اور پست ہمت قوم ادا کرتی ہے، اور جو قوم قیادت وامامت کا خداداد منصب لے کر آئی تھی وہی آج اپنے زمانہ کی پیرو اور مقلد ہے۔ اقبال نے پہلے ہی کہا تھا:

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

دوررس نتائج کے حامل خطرات

قرآن مجید میں مدارس کا تذکرہ

"وما کان المومنون لینفروا کافة فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون۔" (سورۃالتوبۃ:۱۲۲)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا قرآن مجید میں مدارس دینیہ کا تذکرہ ہے؟ کیاان کے فرائض اور واجبات کا ذکر ہے؟ تو میں کہوں گا کہ قیامت تک کے لیے اس آیت میں مدارس کے فرائض اور ذمہ داریوں کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے، اس آیت میں مدارس کی ذمہ داری کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا: ''ایسا کیوں نہیں ہوا کہ مومنوں کی ہر جماعت میں سے ایک جماعت دین میں سمجھ پیدا کرنے کے لیے گھروں سے نکل کھڑی ہوتی، تاکہ جب یہ لوگ دین سیکھ کر اور اس میں سمجھ پیدا کرکے اپنے ملک وقوم میں واپس جائیں تو انہیں عصر حاضر کے فتنوں سے ڈرائیں اور باخبر کریں، تاکہ ان کی قوم ان فتنوں سے چوکنا ہو جائے اور ان سے بچنے کی کوشش کرے۔'' حقیقت میں مدارس کا کام یہی ہے کہ وہ ایسے افراد تیار کریں جو اپنے زمانے کے نئے نئے فتنوں اور سازشوں سے واقف ہوں اور ان کے مقابلہ کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔

صلیبی حملہ

تاریخ کے ایک طالب اور مشرق و مغرب کو قریب سے دیکھنے اور ایک تجربہ کار و واقف کار کی حیثیت سے میں عرض کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں دو بڑے عالم گیر خطرات پیدا ہوئے، ایک تو صلیبی حملہ تھا، جس کا مقصد صرف بیت المقدس پر قبضہ کرنا نہ تھا، بلکہ ان کی پیش نظر حرمین شریفین پر قبضہ کرنا بھی تھا، اگر سلطان صلاح الدین ایوبی کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو نہ کھڑا کیا

ہوتا تو خدانخواستہ آج عالم اسلام کا وجود ختم ہو گیا ہوتا، ایک مرد غیب پیدا ہوا، اس نے مسلمانوں کی منتشر طاقتوں کی یکجا کیا اور پوری قوت سے صلیبیوں پر ضرب لگائی اور ان کو ایسی شکست دی کہ پھر دوبارہ عالم اسلام پر یورش کی جرأت انہیں نہ ہو سکی، اس یورش کے پیچھے کوئی دعوت و تحریک اور فلسفہ نہیں تھا۔

تاتاری یورش

دوسرا خطرہ تاتاری یورش کی صورت میں سامنے آیا، تاتاری جیسی وحشی قوم نے عالم اسلام پر زبردست حملہ کیا اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ان کا نشانہ اگرچہ عراق، ایران اور ترکستان تھے، اور انہوں نے انہیں پوری طرح تاراج کر کے رکھ دیا تھا، لیکن ان تاتاریوں کی ہیبت اور غیر معمولی دھاک دلوں پر ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ اس زمانہ میں یہ بات ضرب المثل بن گئی تھی: **''اذا قیل لک ان التتر قدانهزموافلا تصدق ''** اگر تم سے یہ کہا جائے کہ تاتاریوں کو شکست ہو گئی تو اس بات پر یقین نہ کرنا، اس طرح کہاں عراق و ایران اور کہاں انگلستان کا ساحل، مؤرخین نے لکھا ہے کہ تاتاریوں کی ہیبت سے انگلستان کے ساحل پر مچھیرے عرصہ تک شکار کھیلنے نہیں نکلے، اس زمانہ میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ عالم اسلام سیاسی و مادی لحاظ سے ختم ہو جائے گا، ان کے حملہ کی نوعیت فوجی تھی، جسمانی اعتبار سے مسلمانوں کو قتل کرنا تھا، ان کی یورش کے ساتھ کوئی دعوت نہیں تھی، اور نہ کوئی فلسفہ اور تحریک اس کے پس پردہ کام کر رہی تھی اور نہ ہی کوئی کلچر اور تہذیب اور ثقافت کو غالب کرنے کا جذبہ ان تاتاریوں کے اندر کار فرما تھا، اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کو بھی ختم کرنے کے لیے مصری جنرل الظاہر بیبرس کو کھڑا کیا جس نے تاتاریوں کو شکست فاش دی، اور وہ بے اثر ہو کر رہ گئے، روحانی اعتبار سے بھی اسلام کی دعوت نے اس پوری قوم کو مسخر کر لیا۔

عصر حاضر کے چیلنجز اور خطرات

لیکن آج کے دور میں جو زبردست چیلنج اور غیر معمولی دور رس اثرات و نتائج کے حامل خطرات ہیں، وہ پہلے دو خطرات اور چیلنجوں سے کہیں زیادہ سنگین حد تک مضر اور نقصاندہ ہیں، آج

جدید تعلیم یافتہ اور حکمران طبقہ کے دل ودماغ میں یہ بات پوری طرح راسخ کرنے کی کوشش سیاست واقتدار اور صحافت کے ذریعہ کی جارہی ہے کہ آج کے دور میں اسلام کا کوئی کردار نہیں، اس ترقی یافتہ سائنسی دور میں اسلام کا کوئی پیغام نہیں، وہ ایک پرانی یادگار ہے، وہ جدید دور کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس کی آج کوئی ضرورت نہیں، اس نے ایک زمانہ میں اچھا کردار ادا کیا تھا، اس نے دختر کشی ختم کردی تھی، علم کو اس نے فروغ دینے میں بڑا رول ادا کیا تھا، قدیم یہودی اور عیسائی مذاہب کی طرح اسلام بھی ایک بے جان مذہب ہے۔

عالم اسلام کے خلاف سازشوں کا مرکز اسرائیل

اس وقت یورپ وامریکہ کی پوری طاقت اسی پر صرف ہورہی ہے، آج اسرائیل کی موروثی ونسلی ذہانت وشطارت (چالاکی، اس میں تخریبی ذہانت بھی شامل ہے) اور امریکی وسائل وذرائع، اس کی اعانت اور اثر ونفوذ سب اس بات پر صرف ہورہے ہیں کہ عالم اسلام کے تمام ممالک حتی کہ حرمین شریفین بھی اس سازش کا شکار ہوجائیں، ان مغربی طاقتوں نے عالم اسلام کے حکمرانوں اور وہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ پوری طرح باور کرادیا ہے کہ اس وقت سیکولرزم اور قوم پرستی کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے، مغرب کی مکمل تقلید ہی میں ان کی ترقی اور کامیابی مضمر ہے، یہ اتنا خطرناک اور عالم اسلام کے خلاف اتنی گہری سازش ہے کہ اس کی سنگینی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اس کے دوررس اثرات ونتائج کا اندازہ کرنے سے راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے، نشرواشاعت کے تمام ذرائع کے ساتھ ساتھ سیاسی اور مادی اثر ونفوذ کو بھی استعمال کیا جارہا ہے، ہمارے پاس اس کے دلائل وشواہد ہیں کہ ان تمام سازشوں کا مرکز اسرائیل ہے اور وہی اس کی قیادت کررہا ہے، اس زبردست فتنہ کا مقابلہ مدارس دینیہ ہی کرسکتے ہیں۔

دینی مدارس کا کام

مدارس دینیہ کا کام صرف اتنا ہی نہیں کہ نصابی کتابیں سمجھ لی جائیں، اور مسئلے مسائل بتادیے جائیں، ہم ان کی ناقدری نہیں کرتے، اس نظام تعلیم کا ہم احترام کرتے ہیں، لیکن صرف اتنا کافی

نہیں، موجودہ فتنوں کو سمجھنا، ان سے اچھی طرح باخبر ہونا اور ان کا مؤثر وطاقتور زبان اور دلکش اسلوب میں مقابلہ کرنا وقت کا بنیادی تقاضا ہے، ہمارے طلبہ واساتذہ عربی زبان میں مہارت پیدا کریں، انگریزی زبان میں کمال پیدا کریں، اور ایسا لٹریچر تیار کریں جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کرسکے، ہمارے اساتذہ اور طلبہ کا مطالعہ وسیع، متنوع اور اپٹوڈیٹ (Up to date) ہو، ندوۃ العلماء نے عرب قوم پرستی کے خلاف جو زبردست محاذ قائم کیا تھا اور اس کے فرزندوں نے جس طرح پوری تیاری اور قوت کے ساتھ طاقتور اور مؤثر اسلوب میں اس فتنہ پر ضرب کاری لگائی تھی، اس کا عام طور پر عالم عربی میں اعتراف کیا گیا۔

زندگی اور موت کا محاذ

آپ نے طویل سفر کرکے یہاں آنے کی زحمت کی ہے، آپ نے اتنا طویل سفر کرکے یہاں آکر غلطی نہیں کی، آپ ایسے مرکز میں آئے ہیں جس نے دین کی خدمت کا ایک گوشہ سنبھال رکھا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ ندوی فرزند عرب ممالک کو اپنی طاقتور تحریروں سے متاثر کرسکتے ہیں، انہوں نے عرب قومیت کے فتنہ کے خلاف جو آواز اٹھائی تھی وہ رائیگاں نہیں گئی، اس وقت بھی ندوۃ العلماء ایسے محاذ پر کھڑا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے موت وزندگی کا محاذ ہے، اس وقت تمام مغربی طاقتوں کی یہ زبردست کوشش اور سازش ہے کہ اسلام کسی طرح گوشہ نشین ہوکر رہ جائے، وہ قصۂ ماضی کی طرح بن جائے، زندگی سے سارے رشتے اس کے ختم ہوجائیں، اس وقت اس فتنے کے خلاف صف آرا ہونے کی ضرورت ہے، یہ اہم ترین اور مفید ترین محاذ ہے، یہ اسلام کی زندگی اور موت کا محاذ ہے، اسی محاذ پر ندوۃ العلماء کھڑا ہے۔

دین اسلام کی حفاظت کا وعدہ

"انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون" (سورہ حجر:۸) (ہم نے آپ پر اتاری ہے نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں)۔

یاد رکھو! اس قرآن مجید کے اتارنے والے ہم ہیں اور ہم نے ہی اس کی ہر طرح کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے جس شان و شکل میں وہ اترا ہے، ایک شوشہ کی کمی یا زیر وزبر میں فرق کے بغیر ساری دنیا میں پہنچ کر رہے گا اور قیامت تک محفوظ رہے گا، زمانہ کتنا ہی بدل جائے مگر اس کے اصول واحکام کبھی نہ بدلیں گے، زبان وادب خواہ کتنے ہی ترقی کر جائیں لیکن قرآن کریم کے صوری و معنوی اعجاز میں کوئی کمی نہیں ہوگی، دنیا کی قومیں اور حکومتیں قرآن پاک کی آواز کو دبانے کی چاہے جتنی تدبیریں اور کوششیں کرلیں لیکن اس کے ایک نقطہ یا شوشہ اور زیر وزبر تک کو نہ کم کر سکیں گی، بڑے بڑے اسلام مخالف محققین اور مغرور مخالفوں کو یہ ماننا پڑا کہ دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قرآن مجید کی طرح ہر قسم کی کمی زیادتی سے محفوظ رہی ہو، میور جیسے محقق کا یہ اعتراف ہے، ایک اور یورپین محقق لکھتا ہے: ''ہم ایسے ہی یقین سے قرآن کو بعینہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں جیسے مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں۔''

اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ کاتبوں نے رسم الخط کی، قاریوں نے طرز ادا کی اور حافظوں نے اس کے الفاظ کی حفاظت کی۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوشخبری سنائی ہے کہ قیامت تک امت محمدیہ میں سے ایک جماعت حق پر قائم واستوار اور غالب قوت کے ساتھ دنیا میں موجود رہے گی، انشاء اللہ تعالیٰ اسلام کی تاریخ کا ہر پچھلا دور اس بشارت کی خبر کو دنیا میں سناتا اور اپنے سے اس کی صداقت کو ظاہر کرتا رہے گا۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہ امت تاریخ عالم میں جیسی (مردم خیز) ثابت ہوئی، دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ انتظام خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت کے آدمی کی ضرورت تھی اور زہر کو جس تریاق کی ضرورت تھی، وہ امت کو عطا ہوا، اس کی تاریخ میں کسی بھی تحریف و تبدیلی سے بچانے کا کوئی خلا اور وقفہ نظر نہیں آتا، اصلاح کی مشعلیں اور چراغ مسلسل طریقہ پر ایک دوسرے سے روشن ہوتے رہے اور بڑی تیز و تند ہواؤں میں بھی عالم اسلامی میں ایک سرے سے دوسرے تک اندھیرا نہیں پھیلنے پایا۔

جب تک یہ آیت موجود ہے، پڑھی جارہی ہے، کسی مایوسی کی ضرورت نہیں ہے، ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے، مصلحین اور مربیوں کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے کام میں لگے رہیں، اپنی کوشش اور محنت جاری رکھیں، یہ علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ کس نے اپنے کفر ونفاق سے دل پر مہر لگالی ہے اور کس نے اپنی فطری صلاحیت کو باقی رکھا ہے، اس لیے اپنے نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے:

"انما تنذر من اتبع الذکر وخشی الرحمٰن بالغیب فبشره بمغفرة واجر کبیر"۔ (سورہ یٰس) (تو ڈر سنائے اس کو جو چلے سمجھائے پر، اور ڈرے رحمٰن سے بن دیکھے، سو اس کو خوشخبری دے معافی کی اور عزت کے ثواب کی)۔

یعنی ڈرانے کا فائدہ اسی کے حق میں ظاہر ہوتا ہے جو نصیحت کو مان کر اس پر چلے اور اللہ کا ڈر دل میں رکھتا ہو، جس کو خدا کا ڈر نہیں، نہ نصیحت کی کچھ پروا، وہ نبی کی تنبیہ وتذکیر سے کیا فائدہ اٹھائے گا، ایسے لوگ بجائے مغفرت وعزت کے سزا اور ذلت کے مستحق ہوں گے، اس کا علم اللہ ہی کو ہے کہ کس نے کفر ونفاق سے اپنے دلوں پر مہر لگالی ہے، لہٰذا مصلحین اور داعیوں کا کام اپنے فریضہ کو انجام دینا ہے، ہدایت کا علم اللہ ہی کو ہے۔

قرآن مجید کی بنیاد خدا کے خیال اور اس کے خوف پر ہے، قرآن مجید نے اپنے کو ان کے لیے مفید بتایا ہے جن کے دل پر خدا کے نام کا اثر ہوتا ہے، اور ان کے خاکستر میں کوئی دبی ہوئی چنگاری موجود ہے، قرآن مجید بہر حال ایک صحیفہ اور ایک تعلیم ہے، اس سے فائدہ اٹھانے کا پہلا ذریعہ یہی ہے کہ اس کو غور سے سنے، جو سرے سے کان لگا کر سنتا ہی نہیں اس کے بعد کے مراحل کیا طے کرے

گا، اس لیے فرمایا: **''لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی''** (زبردستی نہیں دین کے معاملہ میں، بیشک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے)۔

جب دلائل توحید بخوبی بیان فرما دی گئیں جن سے منکر کا کوئی عذر باقی نہ رہا تو اب زور سے کسی کو مسلمان کرنے کی کیا حاجت ہو سکتی ہے؟ عقل والوں کو خود سمجھ لینا چاہیے، اور نہ یہ شریعت کا حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بناؤ، چنانچہ فرمایا: **''افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین''** (سورہ یونس: ۹۸) (اب کیا تو زبردستی کرے گا لوگوں پر کہ ہو جائیں باایمان) یعنی آپ کو یہ قدرت نہیں کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دیں، خدا چاہتا تو بیشک سب آدمیوں کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا، ایسا کرنا اس کی حکمت تکوینی و مصلحت کے خلاف تھا، اس لیے اس نے نہیں کیا۔

ابوالکلام آزاد

عوامی مال و دولت پر عیش کرنے والے!

شخصی حکمرانی کا سب سے زیادہ ظالمانہ اور مکروہ نظریہ یہ ہے کہ قوم اور ملک کی دولت صرف فردِ واحد کے آرام و تعیش کا ذریعہ ہوتی ہے اور جب کہ اللہ کے ہزاروں بندوں کو زندہ رہنے کے لیے بدتر سے بدتر غذا بھی میسر نہیں آتی تو وہ سونے کے تخت پر لعل و جواہر کے دانوں سے کھیلتا ہے!

پس جمہوریت صحیحہ کا ایک نہایت اہم رکن یہ ہونا چاہیے کہ حصولِ عزوجاہ اور خرچ مال و دولت کے لحاظ سے عام رعایا اور والی ملک کا درجہ ایک کر دیا جائے اور کوئی ممتاز اور فوق العادۃ حق اسے حصول مال و تسلط خزینہ کا نہ دیا جائے۔

اگر یہ سچ ہے تو دنیا کو رونا چاہیے کہ اب تک اس کی بدبختی ختم نہیں ہوئی۔ وہ حریت و مساوات کے نعرے جو نئے تمدن کی فضا کو ہمیشہ طوفانی رکھتے ہیں، افسوس کہ ابھی اصلیت و حقیقت کے حصول کے محتاج ہیں، انسانی آزادی کا وہ فرشتہ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ''انقلابِ فرانس'' کے پروں سے زمین پر اُترا، گو بہت حسین ہے، مگر پورا کامیاب نہیں۔ آج بھی یورپ کو حریت کا سبق لینے کی ضرورت ہے آج بھی وہ درسِ مساوات کا محتاج ہے، آج بھی اسے مضطرب ہونا چاہیے، تاکہ نوعِ انسانی کے احترام کے معمے کو حل کرے اور خدا کے یکساں اور ہم درجہ بندوں کو تفریق و امتیاز دنیوی کی لعنت سے چھڑانے کی معرفت حاصل کرے۔

یہ سب کچھ اسے اسلام ہی سکھاتا ہے، وہ کل کی تاریکی کی طرح آج کی روشنی میں بھی اس کا محتاج ہے کیوں کہ ''انسانی مسئلہ'' کے حل کی روشنی صرف اسی کے پاس ہے۔

یورپ کہتا ہے کہ مساوات اور حریت کا وہ معلم ہے۔ ہم اس کو سچ مان لیتے ہیں، لیکن پھر یہ کیا ہے جواب تک بادشاہوں کے سروں پر نظر آتا ہے؟ یہ کس کی دولت ہے جو تاجِ شاہی کے ہیروں میں دفن کی جاتی ہے؟ وہ سربفلک عمارتیں، وہ عظیم الشان محل و ایوان، وہ انسانی ترقی کے بہتر سے بہتر وسائل تعیش اور ذرائعِ آرام و راحت جو آج بھی اس کے بادشاہوں اور پریزیڈنٹوں کے لیے لازمی

سمجھے جاتے ہیں، کہاں سے آتے ہیں؟ اور کن کا خون ہے جن کے قطروں سے عظمت و کبریائی کی یہ چادر رنگی جاتی ہے؟

اگر یورپ نے مساواتِ انسانی کا راز پالیا ہے تو پھر اب تک بادشاہ ورعیت کے حقوق و امتیازات میں یہ فرق کیوں ہے؟

یورپ کی مساوات یہ ہے کہ بادشاہ کے ہاتھ سے مطلق العنانی کی باگ چھین لے، مگر اسلام صرف اتنے ہی کو کافی نہیں سمجھتا، بلکہ وہ ان کے سروں پر سے تاج اور ان کے نیچے سے تخت بھی کھینچ کر اُلٹ دینا چاہتا ہے کیوں کہ وہ کسی انسان کو محض خلیفۂ وقت ہونے کی بنا پر یہ حق دینا جائز نہیں رکھتا کہ لاکھوں انسانوں کے سر پر ٹوپیاں ہوں، مگر اس کا ایک سر ہیروں اور موتیوں سے لیپا جائے!

مدینے کا وہ قدوس بادشاہ صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر سوتا تھا اور جسم مبارک پر داغ پڑ جاتے تھے۔ اس کے جانشین عین اس وقت جب کہ روم و عجم کے تخت الٹنے کے لیے حکم دینے والے تھے، پھٹے کملوں کو جسم پر رکھتے تھے اور پتوں کی جھونپڑی کے نیچے سوتے تھے۔ (مولانا ابوالکلام آزاد رحمتہ اللہ علیہ)

اوریا مقبول جان

سیکولر تعلیمی ادارے۔ مکڑی کے گھر

لاہور میں ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے جسے نہر کے کنارے انگریز مشنریوں نے قائم کیا تھا اور جسے بھٹو نے یکساں سلوک کرتے ہوئے پاکستان کے دیگر تعلیمی اداروں کے ساتھ ''قومیا''(Nationalise) کیا تھا اور پھر مغرب زدہ پرویز مشرف نے امتیازی سلوک کرتے ہوئے واپس کر دیا تھا۔ اس ادارے کی بنیادوں میں عیسائی مذہب کی ترویج کے لئے جمع کیا گیا سرمایہ خرچ ہوا تھا جس میں بچوں کو ''بائبل کی اخلاقیات''(Biblical Ethies) پڑھائی جاتی اور سائنس اور دیگر مضامین اس لئے پڑھائے جاتے تھے کہ انگریز سرکار کے لئے اچھے، مطیع، فرمانبردار اور مرعوب کارکن میسر ہو سکیں۔ پرویز مشرف نے جب یہ اور اس طرح کے کئی ادارے واپس کئے تو ''عیسائیت'' کے پلوں سے بہت سا پانی گذر چکا تھا۔ دنیا بھر میں ''مشن'' باقی تھے اور نہ مشنریاں۔ امیر ترین ادارہ ''چرچ آف انگلینڈ'' بھی اپنے چرچ نیلام کر کے اخراجات پورے کر رہا تھا۔ لیکن پرویز مشرف اور اس کی مغرب زدہ ''ذریت'' تو ایسے اداروں کو ریاستی کنٹرول سے آزاد کر کے عالمی ''این جی اور'' کے حوالے صرف اس مقصد کے تحت کرنا چاہتی تھی کہ یہاں ایک مکمل مادر پدر آزاد ''سیکولر'' نظام تعلیم رائج کیا جائے اور اگر حکومت کوئی قانون لاگو کرنا چاہے تو عالمی طاقتیں ان اداروں کے تحفظ اور آزادی کے لیئے میدان میں کود پڑیں۔

آج سے کئی سال پہلے اس ادارے کے ایک سیمینار پر میں مدعو تھا۔ اس وقت تک اس جیسے سیکولر اداروں نے میری گفتگو یا لیکچروں پر ایک غیر اعلانیہ قسم کی پابندی نہیں لگائی تھی۔ لیکن اب تو عالم یہ ہے کہ ان سیکولر تعلیم والے اداروں میں طالب علموں کا کوئی گروہ آزادئ اظہار کا طعنہ دے کر اساتذہ سے کہے کہ دوسرا نقطۂ نظر بھی سننا چاہیے تو طالب علموں کو یہ جواب ملتا ہے ''اوریا'' کے علاوہ جس کو چاہے بلالو۔ ایسے طالب علم اپنی بے بسی کی داستان سناتے ہیں۔

آج سے کئی سال قبل یہ میرا اس ادارے اور اس جیسے اداروں میں آخری لیکچر تھا۔ اس لیکچر کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب شاید مجھے دوبارہ یہاں نہ بلایا جائے۔ اس لئے کہ سوالات و جوابات کے وقفے میں، طلبہ نے باری باری مجھ سے ایسے سوالات کیے جن کی بُنت (Construction) اور طالب علموں کے منہ سے ان کی ادائیگی سے محسوس ہوتا تھا کہ جو لڑکا یا لڑکی سوال پوچھ رہا ہے، اسے خود بھی اس کا اندازہ نہیں کہ وہ یہ سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔ یہ طلبہ ان رٹے رٹائے سوالات کے معاملے میں اتنے لاعلم تھے کہ میرے جوابات کے بعد مزید سوال بھی نہ کر سکے۔ حالانکہ مجھے خود اندازہ تھا کہ میرے جوابات میں سے کئی ایسے ضمنی سوالات نکل سکتے تھے، جن کا میں اگلے سوال میں جواب دینا چاہتا تھا تاکہ پوری بحث کا احاطہ ہو سکے۔ ایسے لگتا تھا جیسے اساتذہ نے ان کی یہی ڈیوٹی لگائی تھی۔ یہ تمام سوالات دراصل وہ فکری مغالطے تھے جو کج بحثی اور دین کا تمسخر اڑانے کے لئے تخلیق کیے گئے ہیں۔

ایسا ہی ایک گھڑا گھڑایا سوال ایک جوشیلے نوجوان نے پوچھا، کہا ''آپ جس ملک کی ٹیکنالوجی استعمال کرو گے، اس کے کلچر اور تصورات بھی زبردستی قبول کرنا ہی پڑیں گے''۔ یہ ایک ایسا مغالطہ ذہنوں میں ڈالا گیا ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ ٹیکنالوجی نہ کوئی زبان رکھتی ہے اور نہ اقدار۔ اسے بالکل اس بات کی خبر نہیں ہوتی کہ ''انسانی حقوق'' کس چڑیا کا نام ہے، وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ ہم جنس پرستی جائز ہے یا نہیں۔ وہ روزانہ ہونے والی معاشرتی، معاشی اور تہذیبی تبدیلی سے بھی آشنا نہیں ہوتی۔ اسے اس بات سے بھی کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کار، جہاز، ایئر کنڈیشنڈ، سی ٹی سکین، کلاشن کوف، گاڑی یا ایسی لاتعداد ایجادات کو استعمال کرنے والا کوئی باریش مولوی ہے یا ننگ دھڑنگ ''ہپی'' ایک حجاب کرنے والی خاتون ہے یا ڈانس فلور پر رقص کرنے والی حسینہ۔ ٹیکنالوجی تو ایک بے روح اور بے جان سی چیز ہے۔ یہاں تک کہ کمپیوٹر کی دنیا بھی ایسی ہے کہ اس میں جو ڈالا جائے گا وہی نکلے گا، جس کے بارے میں مشہور محاورہ ہے، Garbage in Garbage out یعنی کوڑا ڈالو گے تو کوڑا ہی نکلے گا۔ میں نے اس نوجوان سے سوال کیا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان میں کن ممالک کی ٹیکنالوجی استعمال ہوتی ہے؟ رٹے رٹائے سیکولر کے پاس جواب کہاں۔ میرا جواب تھا کہ

جاپان کا یہ دعویٰ ہے کہ پاکستان کے کسی چھونپڑی نما مکان میں بھی ہماری بنائی ہوئی کوئی نہ کوئی چیز ضرور موجود ہو گی، خواہ وہ آڈیو کیسٹ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ دعویٰ سچ بھی ہے۔ جاپان کے ساتھ اگر کوریا، سنگاپور، ملائیشیا اور چین کو بھی ملا لیں تو پاکستان کی ننانوے فیصد سے بھی زیادہ عوام کے گھروں، دفتروں، پلازوں، ہوٹلوں اور دیگر تمام مقامات پر انہی ممالک کی ٹیکنالوجی راج کرتی ہے۔ میرا اگلا سوال یہ تھا کہ ان تمام ممالک کے کلچر، تہذیب، اقدار اور روایات پر پاکستان کے کتنے لوگ آشنا ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ کون لوگ ہیں جو جاپانی کھانوں کے رسیا ہیں، ان کی طرح دوزانو بیٹھ کر چائے پیتے ہیں، ان کی طرح زمین پر سوتے ہیں۔ پاکستان کا کونسا شہر ہے جہاں چینیوں کی طرح کتے کے گوشت کا پلاؤ اور چھپکلیوں کا روسٹ ملتا ہے۔ ان کی زبان تک ہمارے لئے اجنبی ہے۔ شاید ایک فیصد کو بھی علم نہ ہو کہ ''کنفیوشس'' اور ''تاؤ'' کون تھے۔ بڑے بڑے میڈیا کے جغاریوں، خود ساختہ عالموں اور ریاستی دانشوروں کو بھی علم نہ ہو گا کہ چین، جاپان، کوریا اور سنگاپور وغیرہ میں کیسا سیاسی نظام ہے اور کیسی اخلاقیات والی طرز زندگی ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ جاپان سے چین تک اکثر نے ٹیکنالوجی مغربی دنیا سے مستعار لی ہے لیکن ان کی تہذیبی، معاشرتی اور روایتی زندگی پر اس ٹیکنالوجی کا بہت کم اثر ہوا اور ایسا بھی صرف امریکی اور یورپی غلامی کے عرصے میں ہوا۔

تاریخ شاہد ہے کہ تہذیب، کلچر، اخلاقیات اور روایات پر مذہب کے بعد صرف اور صرف دو چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایک نصاب تعلیم اور دوسرا میڈیا۔ نصاب تعلیم ایک بچے کی انگلی پکڑتا ہے اور اسے ایک تصوراتی ماحول میں لے جاتا ہے جس میں جس طرح کے چاہے اخلاق، رواج، اقدار اور اصول خاندان سکھائے اور بتائے جا سکتے ہیں، جن ملکوں پر مغربی طاقتوں نے گذشتہ صدیوں میں قبضہ کیا، ان میں انہوں نے ایسے نصاب تعلیم متعارف کرائے جن میں بچوں کے لئے، یورپ کو خوابوں کی سرزمین اور معیارات کی دنیا کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جاپان سے تھائی لینڈ تک جو بھی اخلاقی زوال اور اقدار کا انحطاط آیا وہ صرف امریکی قبضے کے بعد ایسے نصاب تعلیم کے بہیمانہ استعمال سے ہی آیا، جس نے ان سے قدیم مشرقی حیا چھین کر ان کے پندرہ سے زائد شہروں کو قحبہ خانوں میں تبدیل کر دیا۔ ایسا کچھ افریقہ اور ایشیا کے دیگر ممالک میں برطانیہ اور فرانس نے کیا۔

سوسال کی تعلیمی نصاب کی یورش سے جو نسل تیار ہوئی اس پر گذشتہ پچاس سالوں سے میڈیا کی اخلاقی اور تہذیبی بمباری نے آج اس کا حلیہ تک بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ نصاب تعلیم نے ایک نسل کو اخلاقی اور تہذیبی تبدیلی کے لئے تیار کیا اور میڈیا نے اسے عملی شکل دے دی۔ یہ ایک ''بے حس بنانے کا عمل'' (Desensitization) تھا جو آہستہ آہستہ مکمل ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کل جو حرکت فحش نظر آتی تھی آج وہ محسوس بھی نہیں ہوتی۔ میرے اس جواب پر سناٹا چھا گیا اور اس کے بعد میرا داخلہ ایسے کسی کالج میں غیر اعلانیہ طور پر ممنوع قرار دے دیا گیا۔ مکڑی کے جالے کی اتنی ہی اوقات ہوتی ہے۔

اوریا مقبول جان

منی لانڈرنگ کے عالمی ٹھیکیدار

پاکستان کے کسی ایک شہر کو ترقی کی منازل طے کرنے کے لئے اگر یہ آزادی دے دی جائے کہ تم جس طرح، جہاں سے اور جیسا بھی چاہے سرمایہ حاصل کرو، تمہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا، بلکہ ملکی قانون تمہیں مکمل تحفظ دے گا، تو وہ شہر ایکدم چند برسوں میں دنیا کا امیر ترین اور ترقی یافتہ شہر بن جائے گا۔ یہ کوئی ہوا میں اڑنے والی مضحکہ خیز بات نہیں ہے بلکہ ''جدید مہذب'' دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ دنیا بھر میں لاتعداد ایسے ملک اور شہر میں جو اسی طرح خوشحال ہوئے ہیں۔ ان میں سے صرف دو جگہوں کی مثال ہی اس ''حقیقت'' کو عیاں کرنے کے لئے کافی ہے۔ ''لکسمبرگ'' یورپ کا شہر جو مکمل آزاد ملک بھی ہے، اس کی فی کس آمدنی اٹھاسی ہزار تین سو بارہ (88312) ڈالر ہے۔ دوسرا شہر ''جنیوا'' ہے، جو سوئٹزرلینڈ کا خوبصورت مقام ہے، اور اس کی فی کس آمدنی ایک لاکھ بارہ ہزار (1,12,000) ڈالر ہے اور یہ شہر اپنی فی کس آمدنی کے حساب سے دنیا بھر میں پہلے مقام پر کھڑا ہے۔ کوئی سوال کر سکتا ہے کہ آخر ان دونوں شہروں میں ایسی کیا زرعی، صنعتی یا معدنیاتی دولت ہے کہ یہ دنیا کے امیر ترین مقامات ہیں اور دنیا بھر کے لوگ ان شہروں کو ترقی، شہری زندگی اور خوبصورت ماحول کی وجہ سے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ صرف دو نہیں ہیں بلکہ ایسے لاتعداد شہر ہیں جہاں صنعت وزراعت اور معدنیات کے نام پر کچھ نہیں ہوتا، مگر وہ دنیا کے امیر ترین شہروں میں آتے ہیں، وجہ صرف ایک ہے کہ ان شہروں کو خاص طور پر یہ آزادی دی گئی کہ وہ جس طرح، جہاں سے اور جیسا سرمایہ حاصل کریں اور پھر اس سرمائے کو اپنے ہاں تحفظ بھی دیں۔ ایسا ہی ایک شہر اگر پاکستان میں بھی آباد کیا جائے، جہاں دنیا بھر کے ممالک سے بددیانت، چور، کرپٹ، منشیات فروش، عورتوں کی سمگلنگ کا دھندہ کرنے والے، مافیا کے ڈان، ٹیکس چور، بھتہ خور اور بددیانت

سیاستدان اپنا سرمایہ جمع کرواییں اور پھر انکے اس سرمائے کو مکمل تحفظ حاصل ہو تو ایک سال کے اندر اندر پاکستان کے اس شہر کی فی کس آمدنی بھی دنیا کے امیر ترین شہروں کے برابر آجائے گی۔

یہ تصویر اس لئے کھینچی ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں ''منی لانڈرنگ'' اور ''کرپشن'' کے دھندوں کے سرمائے کی تمام محفوظ پناہ گاہیں یورپ اور امریکہ میں واقع ہیں۔ ہر چور، ڈاکو، بھتہ خور اور منشیات فروش کو وہیں تحفظ ملتا ہے، لیکن ایف اے ٹی ایف کی ''گرے لسٹ'' میں پاکستان کو ڈالا جاتا ہے اور اس کے بعد پاکستان کی پوری حکومتی مشینری اس گرے لسٹ سے نکلنے کے لئے منی لانڈرنگ کے خلاف قانون سازی کر رہی ہوتی ہے۔ سیاسی قیادت اور ریاستی کمزوری کی اس سے بدترین مثال نہیں ہو سکتی۔ یہ کمزوری اور دیوالیہ پن آج سے نہیں بلکہ ہم میں بحیثیت قوم یہ مرض بہت پرانا ہے، جسے انگریزی زبان میں Chronic یعنی کہنہ، دیرینہ اور دائمی کہتے ہیں، ہماری معاشی ترجیحات کا یہ عالم ہے کہ یہاں گذشتہ بارہ سالوں میں آٹھ ہزار خطرناک مجرموں کو اس وجہ سے پھانسی کی سزا نہیں دی جاتی، تاکہ کچھ مصنوعات یورپ کے بازاروں میں بک سکیں اور قاتل، ڈکیت اور جنسی درندے اس لئے اپنے انجام کو نہیں پہنچائے جاتے تاکہ پاکستان کے سرمایہ دار کا بیرون ملک کاروبار پھلتا پھولتا رہے۔ اس دیوالیہ پن میں کون سیاستدان ہوگا جو سینہ تان کر عالمی برادری کو کہے گا کہ ہمیں منی لانڈرنگ کے خلاف قانون سخت بنانے کے لئے دباؤ ڈالنے والو، پہلے اپنے گریبان میں تو جھانکو۔ دنیا بھر سے بددیانت اور چور سیاستدانوں سے لے کر جرائم پیشہ افراد تک، ہر ایک کی پناہ گاہ تو تم خود ہو۔

منی لانڈرنگ اور بددیانتی والے سرمائے کے تحفظ کے حوالے سے دنیا بھر سے چھ ممالک علیحدہ علیحدہ خصوصیات کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔ پہلے نمبر پر ''کیمن آئی لینڈ'' Cayman Island ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر آپ وہاں اپنا سرمایہ چھپاتے ہیں تو وہاں پوری دنیا میں سب سے کم ٹیکس آپ کو دینا پڑے گا اور وہاں پر سرمائے کو ادھر سے ادھر کرنے پر بھی کسی قسم کا کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ یہاں کیپٹل گین، ود ہولڈنگ، پراپرٹی، کارپوریٹ اور انکم کے حوالے سے کسی قسم کا کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ یہاں کے بنک آپ کے سرمائے کی خبر کسی کو نہیں

دیتے۔ یہ آئی لینڈ یا جزیرہ برطانیہ کا حصہ ہے، لیکن اس پر خاص طور پر برطانوی قانون لاگو نہیں کیا گیا۔ امریکہ کے سرمایہ داروں نے اندازاً 32 ہزار ارب ڈالر یہاں اس لئے چھپائے ہیں تاکہ انہیں امریکہ میں ٹیکس نہ دینا پڑے۔ دوسرے نمبر پر ''سوئٹزرلینڈ'' آتا ہے، جس کی شہرت اثاثوں کے تحفظ Asset Protection کے حوالے سے سب سے بہتر ہے۔ ملک میں رازداری کے قوانین تین سو سال پرانے ہیں۔ کوئی بنک کا اہلکار اگر کسی کھاتے دار کی معلومات کسی کو بتائے گا تو اسے چھ ماہ قید کی سزا ہو گی۔ یہاں سرمایہ کو خفیہ رکھنے کیلئے اس کا تعلق آپ کے ملک سے براہ راست ختم کیا جاتا ہے اور پہلے ''کک آئی لینڈ'' Cook Island اور ''نیوس'' Nevis میں اسے لے کر جا کر، پھر یہاں لایا جاتا ہے۔ تیسرے نمبر پر ''جزائر غرب الہند'' Caribbean کا جزیرہ ''نیوس'' Nevis ہے۔ اس کی وجہ شہرت یہ ہے کہ یہاں ''آف شور کمپنیاں'' بنانا سب سے آسان ہے۔ اس وقت دنیا کی ستر فیصد آف شور کمپنیاں یہاں رجسٹرڈ ہوئی ہیں۔ یہاں کے قوانین کمپنیوں کے لئے آئیڈیل ہیں اور یہاں پر بنائی گئی کمپنیاں عالمی سٹاک ایکسچینج میں بھی رجسٹر ہو سکتی ہیں۔ کمپنیوں کے ڈائریکٹرز اور مالکان کے لئے خصوصی تحفظاتی قوانین ہیں۔ چوتھے نمبر پر بھی وسطی امریکہ میں واقع ملک ''بیلازہ'' Beliza ہے۔ یہ قدیم مایا تہذیب کا امین ہے۔ یہاں بہت بڑے جنگل اور بے شمار سمندری حیات کے ساتھ ساتھ چار لاکھ انسان بھی رہتے ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کو یہاں چوری کے سرمائے پر سب سے زیادہ سود ملتا ہے۔ یہاں افراط زر نام کو نہیں اور اس ملک میں رازداری کے قوانین بہت سخت ہیں۔ پانچویں نمبر پر جرمنی آتا ہے جو سرمائے کے تحفظ کے لیئے بہترین ہے۔ یہاں کے بنک دنیا کے سب سے محفوظ بنک تصور ہوتے ہیں، جہاں سرمایہ ڈوبتا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جرمنی کے بنکوں میں اکاؤنٹ کھولنے کے لئے وہاں موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔ آپ اپنے ملک کی جیل میں بیٹھے ہوئے بھی وہاں اکاؤنٹ کھلوا کر سرمایہ منتقل کر سکتے ہیں۔ چھٹے نمبر پر ''سنگاپور'' ہے، جو سرمایہ داروں کے لئے جنت ہے۔ آپ کے پاس 2 لاکھ ڈالر ہیں تو آپ اس ملک میں آف شور اکاؤنٹ کھول سکتے ہیں اور پھر اس کے بعد یہ بنک خود بخود آپ کی باقی ماندہ دولت کی بھی سرمایہ کاری کا پلان بنا کر آپ کو منافع کما کر دے گا اور سوال نہیں کرے گا کہ سرمایہ کہاں سے آیا۔

ان ممالک کے علاوہ اس وقت یورپ کے پندرہ مقامات، افریقہ کے تین، جزائر غرب الہند یا وسطیٰ امریکہ کے 17 مقامات، مشرق وسطیٰ کے 2 مقامات اور مشرق بعید کے 13 مقامات ایسے ہیں جہاں آزادانہ اور بے خوف طریقے سے آپ اپنا چوری کا سرمایہ جمع کروا سکتے ہیں اور پھر اس سرمائے سے کاروبار بھی کر سکتے ہیں یا اس کے سود سے عمر بھر پر تعیش زندگی گزار سکتے ہیں اور ایسا کچھ کرتے ہوئے آپ پر کوئی ہاتھ بھی نہیں ڈالے گا۔ یورپی یونین کے تمام ممالک نے انسانی حقوق کے ایک ایسے کنونشن پر دستخط کر رکھے ہیں، جس کے مطابق اگر کوئی قاتل، چور، منشیات فروش یا بددیانت سیاستدان کسی یورپی ملک کے پاس اپنا سرمایہ لاتا ہے اور پھر وہاں سیاسی پناہ بھی لے لیتے ہے، تو بیشک آپ کا اس مفرور شخص کے ملک کے ساتھ مجرموں کے تبادلے کا معاہدہ ہی کیوں نہ ہوا ہو، آپ اسے کسی ایسی صورت میں واپس اس کے اپنے ملک کے حوالے نہیں کریں گے، جب اس بات کا خطرہ ہو کہ اگر وہ اپنے ملک واپس چلا گیا تو اس پر تشدد ہو گا یا اسے پھانسی دے دی جائے گی۔ جرم کے سرمائے پر پلنے والے اور خوشحال نظر آنے والے یہ یورپ کے ہی ملک ہیں جو چوروں، قاتلوں، عورتوں کے سمگلروں اور منشیات فروشوں کے اتنے ہمدرد ہیں اور کیوں نہ ہوں اسی لوٹ مار کے پیسے سے تو وہ خوشحال ہیں۔

ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی

جدید ترکی کا بانی

بدیع الزمان نُورسی

کسی خطہ زمین میں اسلام کے عروج، زوال اور پھر عروج کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کی بہترین مثال ترکی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب پوری دنیا پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سلاطین بڑے کروفر کے مالک تھے۔ ایک بڑے خطۂ زمین پر اس کی حکمرانی قائم تھی۔ دنیا کی بڑی بڑی مملکتیں اس کے سامنے لرزاں و ترساں رہتی تھیں۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ اس کی حدود مملکت سکڑتی اور سمٹتی چلی گئیں، دیگر ممالک اس پر شیر ہوگئے، یہاں تک کہ انہوں نے عسکری طاقت کی بل پر اس کے حصے بخرے کر دیے۔ اس عرصے میں اس کے ایک فوجی جنرل نے کچھ دم خم دکھایا۔ اس نے ترکی کے دشمنوں سے لوہا لیا اور مملکت کو بچا کر جدید ترکی کی تعمیر کی۔ لیکن اس نے غضب یہ کیا کہ اپنی حدودِ مملکت سے اسلام کو دیس نکالا دے دیا۔ اس نے خلافت کی قبا چاک کر دی، اسلام کا نام لینے کو جرم قرار دیا، اتنا سنگین جرم کہ اس کی سزا موت قرار پائی، اذان پر پابندی عائد کر دی، مساجد کو میوزیم اور گوداموں میں تبدیل کر دیا، دینی مدارس و مکاتب پر تالے ڈال دیے، شرعی عدالتوں کو بند کر دیا اور اوقاف کو ختم کر دیا، اسلامی کلینڈر کی جگہ مغربی کلینڈر جاری کیا، ترکی زبان کے رسم الخط کو عربی سے بدل کر لاطینی کر دیا، خواتین کے لیے حجاب پر پابندی عائد کر دی۔ الغرض اس نے سیکولرازم یعنی لادینیت کو اپنا قبلہ و کعبہ بنالیا اور اسلام کو کھرچ کھرچ کر مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔

لیکن یہ تمام کوششیں ترک عوام کے دلوں سے اسلام کو محو کر دینے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ بندوں کو توفیق دی کہ وہ اسلام کو شمع جلاتے رہیں اور شدید طوفانوں کے باوجود اس کی لوَ کو بجھنے نہ دیں۔ انہوں نے اس راہ میں بے مثال قربانیاں پیش کیں، قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں، جلاوطنی کی زندگی گزاری، دار ورسن کو چوما، حکومت واقتدار سے بے دخل کیے گئے،

پابندیوں پر پابندیاں قبول کیں..... لیکن نہ بکے، نہ تھکے، نہ اپنی راہ کھوٹی کی۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں دھیرے دھیرے ترکی میں اسلام کا کلمہ بلند ہونے لگا، مساجد کے میناروں سے اذانیں سنائی دینے لگیں، مدارس و مکاتب پھر آباد ہونے لگے، خواتین اپنی مرضی سے حجاب اختیار کرنے لگیں اور اس پر روک ٹوک باقی نہ رہی۔ غرض ترکی میں اسلام کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

ترکی میں اسلام کے احیاء کے میدان میں اللہ کے جن بندوں نے غیر معمولی خدمات انجام دیں ان کی طویل فہرست ہے۔ ان میں ایک نمایاں نام شیخ بدیع الزمان نورسی کا ہے۔ ترکی ادبیات کے ماہر جناب ثروت صولت نے انہیں درج ذیل الفاظ میں خراج پیش کیا ہے:

''ترکی میں تجدید واحیائے اسلام کے فرض کو گزشتہ نصف صدی میں جس عظیم ہستی نے انجام دیا وہ استاد بدیع الزماں نورسی کی ذات ہے۔ وہ بلاشبہ اس صدی کی عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی کوششوں سے ترکی میں جس طرح اسلام کا احیاء ہوا ہے اس کی مثال شاید آسانی سے نہ پیش کی جاسکے۔ ان کی اصل اہمیت اور عظمت یہ ہے کہ انہوں نے ناسازگار حالات میں اسلام کی شمع روشن رکھنے کی کوشش جاری رکھی اور پچیس سال کی جدوجہد کے بعد ترکی کو مذہب دشمنی کی راہ سے ہٹا کر ایک بار پھر خادم اسلام ملک کی حیثیت میں تبدیل کردیا۔'' (ثروت صولت، ترکی کا مردِ مجاہد، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی۔ ۱۹۹۶ء، ص۹۔۱۰)

ابتدائی زندگی

سعید نورسی ترکی کے صوبے 'تبلیس' کے ضلع ہیزان کے گاؤں 'نورس' میں 1873ء/1290ھ میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے انہیں نورسی کہا جاتا ہے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے والد سے حاصل کی۔ بعد میں مختلف اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ ان کا حافظہ بڑا غضب کا تھا۔ جو کچھ پڑھتے تھے یاد ہو جاتا تھا۔ ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے کہ مختلف علوم کی 80 کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ان کی قوتِ حافظہ اور غیر معمولی ذہانت کی خبر وقت کے علماء کو ہوئی تو انہوں نے ان کا امتحان لینا چاہا۔ انہوں نے مختلف سوالات کیے جن کے نورسی نے صحیح جوابات دیے۔ یہ دیکھ کر علماء بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ نوجوان تو 'بدیع الزمان' (یعنی نادرِ روزگار) ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ یہ لقب ان کے نام کا جز بن گیا۔

شیخ نورسی نے دینی تعلیم عام کرنے کی غرض سے مصر کی جامعۃ الازہر کے طرز پر جامعۃ الزہراء قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ پر 1951ء میں اس وقت عمل ہو سکا جب ترکی کے وزیر اعظم عدنان مندریس کی جانب سے ان کو مالی امداد فراہم کی گئی۔ اس جامعہ میں عربی، ترکی اور کردی تینوں زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی، البتہ سب سے زیادہ زور عربی زبان پر دیا جاتا تھا اور روایتی علوم کے ساتھ جدید علوم کو بھی شامل نصاب کیا گیا تھا۔

نوجوانوں کی انجمن

مغربی فکر سے متاثر ترک نوجوانوں نے انجمن اتحاد وترقی قائم کی، جس کا مقصد ترکی سے خلافت کا خاتمہ اور مغربی افکار واقدار کی بالادستی قائم کرنا تھا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے 1909ء میں انجمن اتحاد محمدی کی تشکیل کی گئی۔ اس کے بانیوں میں شیخ سعید نورسی کا بھی نام ملتا ہے۔ اس انجمن کا مقصد اسلام کی بنیاد پر خلافت کی تشکیل نو کرنا اور اتحادِ اسلامی کو فروغ دینا تھا۔ اس انجمن کی تشکیل کے کچھ ہی عرصہ بعد بغاوت پھوٹ پڑی، جس میں انجمن کے متعدد افراد سمیت سعید نورسی بھی ماخوذ ہوئے۔ انہیں جیل میں ڈال دیا گیا، ان پر مقدمہ چلا، لیکن عوامی دباؤ کے نتیجے میں جلد ہی انہیں رہا کر دیا گیا۔

جنگ عظیم اول کے دوران سعید نورسی نے فوج میں رضاکارانہ خدمت انجام دی۔ اس عرصہ میں بھی وہ نوجوانوں کی تربیت سے غافل نہیں ہوئے۔ وہ ان کے سامنے قرآن اور اسلامی علوم کا درس دیتے۔ اسی عرصے میں انہوں نے 'اشارات الاعجاز فی مظان الایجاز' تصنیف کی۔ دورانِ جنگ وہ روسیوں کے ہاتھوں قید ہو کر سائبیریا بھیج دیے گئے۔ ایک طویل عرصے تک انہوں نے وہاں کی تکلیفیں برداشت کیں، پھر وہاں سے فرار ہو کر جرمنی، دیانا اور بلغاریہ ہوتے ہوئے واپس استنبول پہنچے۔

قرآن سے تعلق

استنبول آمد کے بعد ہمیں شیخ سعید کی زندگی میں زبردست تبدیلی نظر آتی ہے۔ انہوں نے سیاسی سرگرمیوں سے علیحدگی اختیار کرلی۔ وہ دریائے باسفورس کے کنارے ایک گاؤں منتقل ہوگئے

اور وہاں قرآن مجید کے مطالعہ اور غور وتدبر میں مشغول ہو گئے۔اس کے نتیجے میں انہیں احساس ہوا کہ ان کے اندرون کی تاریکیاں چھٹ گئی ہیں اور قرآن مجید کے نور سے ان کا وجود منور ہو گیا ہے۔اس تجربے نے شیخ کی آئندہ کی تحریروں اور بیانات کا رخ متعین کر دیا اور قرآن سے افادہ واستفادہ کی تحریک نے 'رسائل نور' کا قالب اختیار کر لیا۔

مصطفی کمال پاشا نے ترکی فوج کو منظم کر کے بیرونی طاقتوں کے حملے کو پسپا کر دیا تھا اور ترکی قوم کے اندر بیداری اور خود اعتمادی کی روح پھونک دی تھی۔اس کے پیش نظر ابتدا میں شیخ کے دل میں اس کا احترام پایا جاتا تھا۔وہ اسے الحاد کی تاریکی سے نکال کر اسلام کی روشنی میں لانا چاہتے تھے۔ لیکن لادینی عناصر نے شیخ کے اس ارادے کو کامیاب نہ ہونے دیا۔مصطفی کمال شیخ کی غیر معمولی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے انہیں اپنا آلہ کار بنانا چاہتا تھا، اسی لیے اس نے ان کو مشرقی اناطولیہ کا رئیس الواعظین مقرر کیا اور دار الحکمۃ بورڈ کا رکن بنا دیا۔لیکن شیخ سعید نے اپنی فراستِ ایمانی سے اس کی نیت تاڑ لی اور اس کی تمام نوازشوں کو ٹھکرا کر انقرہ سے چلے گئے۔یہ 1921ء کا واقعہ ہے۔شیخ نے سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو کر خاموش دعوت و تبلیغ اور تربیت وتزکیہ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔

آزمائش

1925ء میں ملحد حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی۔اس بغاوت سے شیخ نورسی کا کوئی تعلق نہ تھا، لیکن محض شک کی بنیاد پر انہیں گرفتار کیا گیا اور وہاں سے مشرقی اناطولیہ کے ایک گاؤں بردور میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس کے بعد تو قید وبند، پولیس کی نگرانی میں نظربندی، جلاوطنی، ایذا وتعذیب، عدالت میں پیشی، جھوٹے مقدمات اور بے بنیاد الزامات وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا، جس سے شیخ کی زندگی اجیرن کر دی گئی۔لیکن ان کے پائے ثبات واستقامت میں ذرا بھی لرزش نہ آئی۔ انہوں نے رسائل نور کی تصنیف وتالیف اور ان کی خفیہ ترسیل واشاعت کا کام جاری رکھا۔بردور سے انہیں جلاوطن کر کے اسپارٹا کے ایک گاؤں بارلا بھیج دیا گیا، جہاں وہ آٹھ سال مقیم رہے۔وہاں پولیس کا سخت پہرہ بٹھا دیا گیا اور کسی کو بھی ان سے ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی۔

ان کے اخلاق وکردار سے متاثر ہو کر ان کے پہرے دار ہی ان کے ہم نوا بن گئے۔وہ وہاں جو رسائل تصنیف کرتے انہی پہرے داروں کے ذریعے وہ دوسرے لوگوں تک پہنچتے۔

1934ء میں شیخ نورسی پر خفیہ مذہبی تنظیم قائم کرنے اور ترکی کے سیکولرزم کے خلاف کام کرنے کا الزام لگا کر انہیں ان کے ڈیڑھ سو شاگردوں کو گرفتار کیا گیا۔مقدمہ چلایا گیا، لیکن ان کے خلاف کوئی پختہ ثبوت نہ مل سکا، پھر بھی پندرہ دیگر افراد کے ساتھ انہیں چھ ماہ کی سزا سنائی گئی۔رہائی کے بعد انہیں بحر اسود کے ساحل پر آباد ایک گاؤں 'کاستامانو' جلاوطن کر دیا گیا۔وہاں بھی انہوں نے رسائل نور کی تصنیف اور ان کی اشاعت کا کام جاری رکھا۔1943ء میں انہیں ایک بار پھر عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا اور ان پر حکومت کے خلاف سرگرمیاں انجام دینے کا الزام لگایا گیا۔انقرہ یونیورسٹی کے پروفیسرس پر مشتمل ایک ٹیم بنائی گئی جس کے ذمے ان کے رسائل کا جائزہ لینے کا کام سونپا گیا۔کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ یہ رسائل خالص مذہبی نوعیت کے ہیں۔اس کی رپورٹ پر انہیں بری کر دیا گیا اور انہیں رہائی مل گئی۔

1947ء میں شیخ نورسی کو ایک بار پھر جلاوطن کر دیا گیا۔ان پر پولیس کا سخت پہرہ بٹھا دیا گیا اور ان سے لکھنے پڑھنے کی آزادی بھی چھین لی گئی۔لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔متعدد افسران ان کی تقریروں اور تحریروں سے متاثر ہو کر ان کے معتقدوں میں شامل ہو چکے تھے۔ان لوگوں کے تعاون سے انہیں کارکنوں سے ملنے اور اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت مل گئی۔1947ء کے اواخر میں ایک بار پھر انہیں عدالت میں طلب کیا گیا اور پرانے الزامات دہرا کر بیس ماہ کی سزا سنائی گئی۔ ترکی کے مختلف مقامات سے شیخ کے ان عقیدتمند کارکنوں کو بھی پابند سلاسل کیا گیا جو رسائل نور کو تقسیم کرتے تھے۔عدالت عالیہ نے یہ سزا منسوخ کر دی، لیکن انہیں دوبارہ اسی الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔دو سال کی نظربندی کے بعد ستمبر 1949ء میں ان کی رہائی ہوئی۔

رسائل نور

شیخ نورسی نے اب اپنی دعوت کا مرکز مشرقی اناطولیہ کے بجائے دیار بکر کو بنایا۔ اس سے حکومتی جارحانہ کارروائیوں میں کچھ کمی آئی۔ اس عرصے میں رسائل نور کی توسیع واشاعت میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ انقرہ اور استنبول کی یونیورسٹیوں کے طلبہ میں یہ رسائل بہت مقبول تھے۔ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان کی تعلیمات وافکار سے کافی متعارف ہو چکا تھا۔ 1950ء میں عدنان مندریس ترکی کے وزیر اعظم بنے تو انہوں نے اسلامی افکار واقدار کے بارے میں کچھ نرمی کی پالیسی اختیار کی۔ لیکن پھر بھی شیخ نورسی کے ابتلا وآزمائش میں کچھ کمی نہیں آئی۔ 1952ء میں انہیں ان کے رفقاء کے ساتھ ایک بار پھر گرفتار کیا گیا اور استنبول میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان پر رسائل نور کی اشاعت اور تقسیم کے ذریعے حکومتی پالیسیوں کی مخالفت کی فرد جرم عائد کی گئی۔ عدالت میں جرم ثابت نہ ہو سکا تو انہیں رہا کر دیا گیا، لیکن استنبول چھوڑ کر امیر داگ چلے جانے کی ہدایت دی گئی۔

1953ء میں شیخ اسپارٹا منتقل ہو گئے، جہاں انہوں نے زندگی کے باقی ایام گزارے۔ یہاں ان کے معتقدین کی بھی ایک بڑی تعداد قیام پذیر تھی۔ اب تک رسائل نور کی نقلیں تیار کروا کے انہیں بڑے پیمانے پر عوام میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہاں بعض رسائل زیور طباعت سے بھی آراستہ ہوئے۔ زندگی کے آخری ایام میں بھی پولیس کی طرف سے تفتیش، دھمکی اور جانچ پڑتال جاری رہی۔ مارچ 1960ء میں شیخ اورفہ تشریف لے گئے، لیکن وہاں پہنچتے ہی حکومت نے فوراً شہر چھوڑنے اور اسپارٹا واپس جانے کے احکام صادر کر دیے۔ ابھی شیخ اورفہ ہی میں تھے کہ ان کا آخری وقت آپہنچا اور 24 مارچ 1960ء کو ان کی وفات ہو گئی۔

رسائل کے اثرات

نورسی تحریک میں رسائل نور کی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ شیخ نے چھوٹے بڑے 130 رسائل تصنیف کیے ہیں۔ ان میں آسان الفاظ اور دل نشین اسلوب میں قرآنی علوم ومعارف کی

تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کی مکمل تفسیر لکھنے کے بجائے دینی اقدار ومفاہیم کو قرآنی آیات کی روشنی میں بیان کیا اور اعجازِ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ان رسائل میں ترکی کے سیکولر معاشرے پر تنقید کی گئی ہے اور اصلاحِ حال کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان رسائل کا مقصد تصنیف یہ تھا کہ عوام کو غلط راہوں پر چلنے سے روکا جائے اور ان کے لیے صحیح سمتِ سفر کی نشاندہی کی جائے، تاکہ وہ صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کر سکیں اور اللہ تعالی کی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ بعض رسائل نور میں سائنسی ایجادات اور صنعتی ترقیات سے متعلق قرآن مجید کی پیشینگوئیوں اور معجزات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس طرح شیخ نے اس پہلو کی جانب توجہ دلانا چاہا تھا کہ دورِ جدید کی ترقیات کے سلسلے میں قرآن مجید سے رہ نمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

سیاست پر اثرات

کہا جاتا ہے کہ شیخ نورسی نے اپنے رسائل میں سیاسی افکار سے بحث نہیں کی ہے۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن ان رسائل میں آیاتِ قرآنی کی جو تعبیر وتشریح پیش کی گئی ہے ان کے سیاسی مضمرات ضرور تھے۔ ان رسائل کے ترک معاشرے پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ شیخ نورسی کی دعوتی جدوجہد اور ان کی تحریک کا جامع تعارف آج سے چار دہائیوں قبل (1975ء میں) مشہور دانشور خاتون مریم جمیلہ نے ان الفاظ میں کرایا تھا:

''بدیع الزماں نورسی کی طاقت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انہوں نے اپنی مشکلات اور مجبوریوں کو سمجھ لیا تھا اور مسلمان جن حالات میں مبتلا ہیں ان کا حقیقت پسندانہ اندازہ کر لیا تھا۔ انہوں نے دانشمندی سے کام لے کر ایک سخت، بے لچک تنظیم قائم کرنے سے احتراز کیا، کیونکہ اس قسم کی تنظیم پر ایک صاحب اقتدار آمر آسانی سے پابندی لگا سکتا ہے، اس کے رہنماؤں کو قید کر سکتا ہے اور ان کو پھانسی دے سکتا ہے۔ سعید نورسی نے اس کے برخلاف تبلیغ واشاعت اور اپنی کتابوں کے ذریعے ہزاروں ترکوں کے دلوں میں ایمان کی جڑیں مضبوط کر دیں۔ یہ ایسی تحریک تھی جس پر کوئی

پابند نہیں لگائی جاسکتی تھی اور ایک جابر ترین استبداد بھی اس کی تعلیمات کو پھیلنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ نورسی تحریک کا طریق کار ایک استبدادی نظام کے تحت، جو مسلمان ملکوں کا مقدر بن چکا ہے، زندگی گزارنے والے مختلف طبقوں کے لوگوں میں کام کرنے کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ اس دعوے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ آج ترکی میں جو کچھ اسلام باقی ہے بدیع الزماں سعید نورسی کی انتھک اور بے لوث جدوجہد کا نتیجہ ہے۔'' (ترکی کا مرد مجاہد، حوالہ سابق، ص13-14)

شیخ سعید نورسی کی زندگی مثالی زندگی تھی۔ شدید مخالف ماحول میں انہوں نے بڑی حکمت اور دانشمندی سے اصلاحی سرگرمیاں انجام دیں اور ہر طرح کی آزمائشوں کا دیوانہ وار مقابلہ کیا۔ ان کی خاموش دعوت وتبلیغ کے ترک معاشرہ پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ان کی جدوجہد ترکی کی جدید تاریخ کا روشن باب ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان کی کوششیں ثمر بار ہو رہی ہیں اور ترکی کی پیش رفت آہستہ آہستہ پھر اسلام کی جانب ہو رہی ہے۔

اوریا مقبول جان

دو مذہب کے علمبرداروں کا تحرک

دنیا کے خاتمے سے پہلے ہونے والی بڑی جنگ جسے عیسائی، ارمیگاڈون (Armageddon)، یہودی ہرمیگیڈو (Har MegIddo) ہندو کالکی کالیوگ اور مسلمان ملحمتہ الکبریٰ کہتے ہیں، اس کے صرف اور صرف دو محاذ ہیں۔ ایک بھارت اور دوسرا اسرائیل۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ان دونوں محاذوں پر صرف ایک ہی قوت اور ایک ہی دین کے پیروکار آج بھی لڑ رہے ہیں اور آخری بڑی جنگ تک لڑتے رہیں گے، وہ مسلمان ہیں۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث، ''الکفر'' ملت واحدہ (کفر ایک قوم ہے) کے مصداق مسلمان گذشتہ پچاس سالوں سے اگر نام نہاد سیکولر عیسائیوں سے لڑے ہوں یا صیہونی غلبے کے علمبردار یہودیوں سے برسرپیکار رہے ہوں، ہندوؤں کے دل، زبانیں حتیٰ کہ سول اور عسکری قوت بھی مسلمانوں کے مخالفین کا ہی ساتھ دیتی رہی۔ اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں پر مشتمل جدید مغربی تہذیب وطاقت بھی مسلمان اور ہندوؤں کے معرکے میں ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ ہی رہی۔ لگتا ہے یہ دونوں محاذ اپنی آخری بڑے لڑائی کے لیے گرم ہو چکے ہیں''۔

دنیا گذشتہ پانچ ماہ سے کرونا کی لڑائی لڑ رہی ہے۔ شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جو اس خوفناک عفریت سے بچا ہوا ہو۔ ایک اندازے کے مطابق ایک کروڑ لوگ اس مرض کا شکار ہو چکے ہیں اور پچاس لاکھ ان میں سے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکے، ہر طرف ایک پکار ہے کہ کرونا نے پوری دنیا کی معیشت، معاشرت اور انفرادی زندگی کو روند کر رکھ دیا ہے، لیکن ایسی خوفناک صورتحال میں بھی بھارت اور اسرائیل دو ایسے ممالک ہیں جو اپنی، جنگی برتری اور توسیع پسندانہ غلبے کے لیے میدان جنگ میں کود چکے ہیں۔ کرونا کی دہشت اور امریکہ میں سیاہ فام شخص جارج فلائیڈ (George Floyd) کی موت کے بعد پھوٹنے والے نسلی فسادات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اسرائیل وزیراعظم بنجمن نیتن یاھو نے اعلان کیا ہے وہ اپنے انتخابی وعدے کو پورا کرتے ہوئے 1967ء میں اردن سے چھینے جانے والے مغربی کنارے (West Bank) کے علاقے کو یکم جولائی 2020ء کو قانونی طور پر

اسرائیل میں شامل کرلے گا۔ یعنی اس کالم کی تاریخ اشاعت سے ٹھیک چار دن بعد یہ سانحہ رونما ہونے والا ہے، اور امت مسلمہ کے ستاون ممالک میں کس قدر خاموشی اور بے حسی ہے۔ نیتن یاھو ان یہودی رہنماؤں میں سے ایک ہے جو پہلے دن ہی فلسطینی ریاست کے تصور کا مخالف تھے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مغربی کنارے کا تھوڑا سا علاقہ بھی اگر اسرائیل کے کنٹرول میں نہ رہا، تو اسرائیل کی سلامتی اور سیکورٹی خطرے میں پڑ جائے گی۔ گذشتہ ستر سال سے امریکہ میں یہی نظریہ مسلسل بیچا جارہا ہے، جس کی بنیاد پر امریکہ کے عوام کا سرمایہ اسرائیل کی سیکورٹی پر خرچ کیا جاتا رہا ہے۔

مغربی کنارہ دراصل وہ علاقہ ہے کہ جب جنگ عظیم اول میں خلافتِ عثمانیہ پر فتح کے بعد فرانس، برطانیہ اور امریکہ کے درمیان 1920ء میں سان ریمو کانفرنس (San Remo Conference) کے معاہدے کے تحت تقسیم ہوئی تو اس علاقے کو برطانوی عملداری میں دے دیا گیا، تاکہ ایک فلسطینی ریاست قائم کی جاسکے۔ انگریزوں نے غداری کے صلے میں شریف مکہ کے بیٹے کو اس علاقے سے متصل علاقہ اردن کی صورت سونپ دیا تھا۔ اس شخص امیر عبداللہ اول بن الحسین نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ بنی ہاشم سے ہے جنہیں عرب کی اصل قیادت کا حق ہے، اس لئے وہ تمام عرب علاقوں کو جمع کرے گا اور اس نے اس علاقے پر اپنا اولین دعویٰ 1920ء میں ہی کردیا۔ دوسری جانب برطانیہ اس سے چار سال پہلے ہی خفیہ طور پر 1916ء میں بالفور ڈیکلریشن پر دستخط کرچکا تھا، جس کے تحت وہ اسرائیل کے قیام، یہودیوں کو ایک قوم ماننے اور ان کے اپنی ارض مقدس میں واپس لوٹنے کا حامی اور مددگار تھا۔ متنازعہ ترین شہر یروشلم اسی علاقے میں واقعہ ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد اقوام متحدہ قائم ہوئی اور علاقوں اور ملکوں کی از سر نو حد بندی ہوئی تو 1947ء میں مغربی کنارے سے ملحقہ علاقوں کو تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا، (۱) عرب ریاست (۲) یہودی ریاست اور (۳) عالمی انتظام کے تحت آزاد شہر ''یروشلم''۔ جیسے ہی اسرائیل کا قیام 1948ء عمل میں آیا تو عرب اسرائیل جنگ شروع ہوگئی۔ اس جنگ کے دوران یہ علاقہ نہ تو اسرائیل کے نقشے میں شامل تھا اور نہ ہی اردن کے نقشے میں موجود تھا، اسے مجوزہ فلسطینی ریاست کے لیے برطانیہ نے اپنے کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ جنگ کے دوران اردن نے اقوام متحدہ کے تقسیم کے پلان کے مطابق سے علاقے پر قبضہ کرلیا اور

1950ء میں اسے اردن کا قانونی حصہ قرار دے دیا۔ اپنے قیام کے انیس سال بعد، جون 1967ء میں اسرائیل اپنی پوری جنگی تیاری کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ اس چھ روزہ جنگ میں اسرائیل نے مغربی کنارے پر قبضہ کرلیا اور ساتھ ہی مشرقی یروشلم پر بھی قبضہ کرلیا، مغربی یروشلم پر وہ 1948ء کی جنگ میں پہلے ہی قبضہ کرچکا تھا۔ اس یروشلم کا مقدس شہر مکمل طور پر اس کے قبضے میں آگیا۔ یروشلم کی مشرقی حصے کی ہی اصل اہمیت ہے، کیونکہ اس میں یہودی کا سب سے مقدس مقام ''دیوار گریہ''، مسلمانوں کی ''مسجدِ اقصیٰ''، عیسائیوں اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ ''قبتہ الصخریٰ'' اور ''کنسیہ القیامہ'' یعنی وہ مقام جہاں عیسائیوں کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب سے اتار کر دفن کیا گیا تھا پھر وہ وہیں سے دوبارہ زندہ ہو کر آسمانوں کی سمت چلے گئے تھے۔ یہ مقبرہ آج بھی ایک خالی قبر کی صورت ہے، جس پر گرجا تعمیر کیا گیا ہے۔ یروشلم کا قدیمی شہر بھی مشرقی یروشلم میں ہی ہے جس کی گلیوں میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور ان سے پہلے آنے والے لاتعداد پیغمبر رہتے رہے۔ اسی شہر سے سید الانبیاء ﷺ معراج پر روانہ ہوئے تھے۔ اس مغربی کنارے میں اس وقت تقریباً بیس لاکھ مسلمان آباد ہیں اور 1967ء سے لے کر اب تک اسرائیل نے دنیا بھر سے چار لاکھ یہودیوں کو یہاں لاکر آباد کیا ہے۔ ان بیس لاکھ مسلمانوں کے علاوہ اصل اسرائیل میں بھی اس وقت 16 لاکھ مسلمان آباد ہیں، جبکہ یہودیوں کی تعداد 73 لاکھ ہے۔ انگریزوں نے اپنے وفادار قادیانیوں کو بھی 1920ء میں یہاں لاکر آباد کیا تھا جن کی تعداد اس وقت پچیس سو ہے، اسی طرح علوی اور دروزی بھی ڈیڑھ لاکھ کے قریب وہاں رہتے ہیں۔ ان سب پر یہودی قبضہ اور غلبہ گذشتہ ستر سال سے برقرار ہے۔

آج سے چار دن بعد اسرائیل اس متنازعہ علاقے کو اپنا حصہ بنانا شروع کردے گا۔ عین ممکن ہے کہ فوراً صرف چند فیصد علاقوں کا اعلان کیا جائے اور دنیا کا ردعمل دیکھ کر پھر کرونا کا بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔ مسلم دنیا پر اس وقت کرونا کی وباء تو بہت کم ہے لیکن ان میں مدت سے بے حسی اور مغلوبیت کا وائرس سرایت کرچکا ہے۔ اسرائیل اگر ایک ہی دن میں تمام مغربی کنارے اور یروشلم کو ضم کرنے کا اعلان کرے تو لگتا ہے پھر بھی مسلمانوں کی غیرت نہیں جاگے گی۔

دوسرا محاذ جنگ یعنی ہندوستان بھی اسی کرونا میں دنیا کی مصروفیت کے عالم میں ہی گرم ہوا ہے۔ گذشتہ تین ماہ میں ڈیڑھ سو کے قریب کشمیری شہید کئے گئے اور لداخ کے علاقے پر قبضہ جمانے کے لئے چین سے پنگا لیا گیا ہے۔ یہی تو وہ دونوں محاذ ہیں جن کی جانب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو لڑنے اور جہاد کرنے کی ترغیب دی ہے۔ وہ لوگ جو آج سے پہلے سید الانبیاءﷺ سکی ملحمۃ الکبریٰ اور دور فتن کی احادیث پر تنقیدی گفتگو کرتے ہوئے اسماء الرجال کی بحث چھیڑتے تھے، آج وہ تمام حدیثیں روز روشن کی طرح اپنا وجود ظاہر کر رہی ہیں۔ چار دن بعد کیا ہوگا۔ شاید کوئی ایک مردہ سی آواز بھی امت مسلمہ سے برآمد نہ ہو سکے، لیکن یاد رکھیں احادیث کے مطابق اب ایک ایسا وقت شروع ہونے جا رہا ہے، جس کی آتش کی تپش سے شاید کوئی ایک مسلمان گھر بھی ایسا نہ ہو جو بچ پائے۔ ہر مسلمان کو اس ملحمہ کا ایندھن بننا ہی پڑے گا۔ یہی تقدیر الٰہی ہے اور یہی سید الانبیاءﷺ کی پیشگوئی ہے۔